جلد ۷۸ — نومبر ۱۹۷۲ء — عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ٹیلیفون نمبر ۵۲۵۰۷ رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے خریدار اور ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے لیے جتنا کاغذ کا کوٹہ ماہوار درکار ہوتا ہے، پرمٹ پر اُتنا نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے باقی کاغذ بازار سے گراں نرخ پر خرید کر پرچے کی مطلوبہ تعداد پوری کرنی پڑتی ہے۔

اِس لیے مجبوراً ہمیں پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا ماہ دسمبر ۷۲ء سے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس ۱۰/ روپے ہوگا

منیجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	نومبر ۱۹۷۲ء مطابق شوال ۱۳۹۲ھ	جلد ۷۸

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
۸ روپے	۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور	۸۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان اگرچہ بڑی نیک تمناؤں اور پاکیزہ ارادوں کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا مگر افسوس جب یہ سہانا خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا تو عالمِ واقعات میں جو کچھ ہُوا وہ ان مقدس آرزؤں کا خون تھا جنہیں پاک و ہند کے مسلمان برسہا برس سے سینوں میں پال رہے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے انہوں نے پاکستان کی تشکیل کے وقت آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا۔ اس حزنیہ کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ مسلم قوم کے جذبات کو پاکستان بننے کے بعد جتنے چرکے لگے ہیں اور انہیں جن مصائب سے پیہم دوچار ہونا پڑا ہے اُن کا پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے کبھی تصوّر بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ پاکستانی مسلمانوں کی محرومیوں اور صدمات کی فہرست طویل ہے لیکن شاید اُن میں سرِ فہرست دستور سازی کا المیہ ہے۔ اُس ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جو قومیت کے کسی مادّی تصوّر کی اساس پر معرضِ وجود میں آنے کے بجائے ایک خاص دینی اور اخلاقی مقصد کے حصُول اور ایک خاص روحانی نظریۂ حیات کے عملی تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے معرضِ وجود میں آئے مگر قائم ہوتے ہی اس مقصد اور نظریۂ حیات کو نظروں سے اوجھل کر دے اور اس کے باشندے پورے ۲۵ سال تک اندھیروں میں بھٹک کر اپنی قوتیں ضائع کرتے رہیں۔

وہ قومیں جن کا مقصد محض حصُولِ آزادی ہوتا ہے ان کے لیے آزادی حاصل کر لینے کے بعد یہ سوال واقعی بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے کہ اُن کی جدوجہد کی کیا سمت ہو لیکن وہ قومیں جو آزادی کو مقصود بالذات سمجھ کر اس کے لیے کوشاں نہیں ہوتیں بلکہ اُسے کسی دوسرے ارفع و اعلیٰ مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کے لیے تگ و دو کرتی ہیں ان کے لیے سمت کا تعین قطعاً کوئی مسئلہ نہیں

ہوتا کیونکہ اُن کی سمت تو پہلے سے متعین ہوتی ہے اور وہ آزادی کی بھی اس لیے طالب ہوتی ہے کہ غلامی زائل کئے بغیر صحیح سمت پر بڑھنے کی راہ میں جو موانع کھڑے کر رکھے ہیں اُنہیں دُور کرکے وہ سرعت کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکیں۔ اس طرح کی بامقصد اور مخصوص نظریات کی علمبردار قومیں اجتماعی جدوجہد کے رُخ متعین کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں بلکہ اپنی صلاحیتیں مقصد کے حصُول اور نظریۂ حیات کی سربلندی میں کھپاتی ہیں۔ ہم اسے عہدِ حاضر کا ایک عظیم المیہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مقدس سرزمین ربع صدی گزرنے کے بعد بھی عملاً ایک خطۂ بے آئین ہے اور اس کے باشندے جو پاکستان بننے سے پہلے ایک مقصد کے حصول کی خاطر باہم متحد تھے۔ اب کربناک انتشار کا شکار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قوم کے اندر جو یہ خوفناک قسم کی پریشان فکری پیدا ہوئی ہے اس کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا نہایت واضح اور دو ٹوک جواب یہ ہے کہ اس کا ذمّہ دار وہ محدود سا طبقہ ہے جو فکر و احساس کے اعتبار سے پاکستانی سے کہیں زیادہ مغربی ہے مگر جسے انگریز تقسیمِ ملک کے وقت اقتدار کی باگیں سونپ کر رخصت ہُوا۔ اس "مؤثر اور بااختیار اقلیت" کی سازشوں سے ملک ابھی تک اسلامی دستور کی برکات سے محروم رہا ہے اور جو کام پاکستان بننے کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانا چاہیے تھا وہ آج تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ یہ بات کسی حد تک اطمینان کی موجب ہے کہ پاکستان کی دستوری بنیادوں پر مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے اور اس سمجھوتے سے یہ آس لگی ہے کہ اس مقدس سرزمین پر کسی اچھے دستور کی عملداری ہو گی اور اس طرح عوام اور حکمران ایک ضابطہ کے مطابق اپنے حقوق کا تحفظ اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں گے ہم نے اس سمجھوتے کو "کسی حد تک اطمینان بخش" اس لیے کہا ہے کہ گذشتہ سالوں میں دستور سازی کا جو حشر ہوتا رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے ذہنوں میں کئی ایک خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ خدشات غلط ثابت ہوں اور ملک ایک صحیح اسلامی دستور کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔

ان صفحات میں ہم ان چند خدشات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں:

ہمارا پہلا خدشہ نوعیت کے اعتبار سے اُس بدنصیب عورت کے احساسِ محرومی سے ملتا ہے جسے

ہم بچپن میں گھر کی بوڑھی عورتوں سے سوئیوں کی کہانی میں سنا کرتے تھے، یعنی ایک شہزادی کو اس کے باپ نے کسی وجہ سے ناراض ہو کر گھر سے نکال دیا اور اتفاقاتِ زمانہ سے وہ ایک ایسے شہزادے کے پاس جا پہنچی جس کے سارے بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور نیم جان پڑا تھا۔ یہ بدنصیب شہزادی بڑی محنت اور دلسوزی کے ساتھ اس کے بدن سے سوئیاں نکالتی رہی مگر جب آخری سوئی نکالنے کا وقت آیا جس کے نکلتے ہی شہزادے کو ہوش میں آنا تھا تو عین اس وقت ایک ایسی عورت درمیان میں آ ٹپکی جس کے منحوس ہاتھ لگتے ہی شہزادے کے سارے جسم میں از سرِ نو سوئیاں پیوست ہو گئیں۔ قسمت کی ماری شہزادی پھر انہیں نکالنے میں مصروف ہو گئی، مگر ہر بار جب ایک سوئی باقی رہ جاتی تو پھر کوئی اسی قسم کا حادثہ پیش آ جاتا جس سے شہزادے کے جسم میں پھر سے سوئیاں چبھ جاتیں اور اس طرح اس بدنصیب شہزادی کی محنت مسلسل رائگاں جاتی رہی۔

ہمارے اس ملک میں تدوینِ دستور کی داستان بھی اسی طرح حسرتناک ہے جس طرح شہزادی کی محنت کا زیاں اور شہزادے کا تکلیف اور دکھ سے نجات حاصل کرتے کرتے پھر سے اُس میں مبتلا ہو جانا۔ اگر عوام کو بدنصیب شہزادی کے مقام پر رکھ کر اور دستوری مسئلے کو شہزادے پر قیاس کر کے غور کیا جائے تو یہ داستان اسی طرح دلفگار معلوم ہوتی ہے جس طرح ہم سوئیوں کی کہانی میں دیکھتے ہیں۔ دستور کا مسئلہ ہمارے لیے کوئی خاص مسئلہ نہ تھا۔ اس کے بارے میں قوم نہایت صحت مندانہ رجحانات رکھتی ہے اور نہ صرف دستوری بنیادوں کے معاملے میں بلکہ ضروری جزئیات کے بارے میں بھی پوری طرح متفق و متحد تھی مگر بے دین طبقے نے نوکر شاہی سے ساز باز کر کے ایک طرف تو عوام کو بے بس بنا کر رکھ دیا اور دوسری طرف اسلام کی اساس پر تیار ہونے والے دستوری ڈھانچے میں شکوک و شبہات کی زہریلی سوئیاں چبھو کر اسے بے جان بنانے کی کوشش کی۔ اسلام کے شیدائی اور ملک کے بہی خواہ بڑی محنت کے ساتھ شکوک و شبہات کی ان سوئیوں کو نکالتے اور اسے ایک غالب قوت بنانے کے لیے پوری قوم کو تیار کرتے، مگر چند منحوس ہاتھ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے اور اس کے بدن میں سوئیاں چبھو کر اسے نیم جان بسمل کی طرح دُور پھینک دیتے۔ اہلِ پاکستان کے گذشتہ پچیس برس محنت کے پیہم زیاں اور بار بار کی محرومیوں کے صدمات سہتے گزرے ہیں۔ وہ دستور کے معاملے میں ساحلِ مراد پہ پہنچنے والے ہی ہوتے ہیں کہ کوئی بپھری ہوئی موج یکایک نمودار ہوتی ہے اور ان کے اور

ساحل کے درمیان طویل فاصلے حائل کر دیتی ہے۔

جس وقت پاکستان معرضِ وجود میں آیا اُسی وقت پاکستانی عوام نے اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ شروع کیا یعنی جو کام خود برسرِ اقتدار طبقے کو آگے بڑھ کر فوراً کرنا چاہیے تھا اس کے لیے عوام کو تقاضا کرنا پڑا۔ اصحابِ اقتدار کی اس روش سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ اسلامی دستور سے فرار کی راہیں تلاش کر رہے ہیں اور اسے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر اس کے اٹھانے میں سخت متامل ہیں چنانچہ اسلامی دستور کے خلاف پراپیگنڈے کی باقاعدہ مہم شروع کی گئی اور اسے ایک فرسودہ اور ناقابلِ عمل دستور ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ جو افراد یا طبقے کسی پہلو سے بھی اسلامی دستور کے نفاذ میں مزاحم ہو سکتے تھے یا اس کے خلاف عوام کے ذہنوں میں کوئی بدگمانیاں پیدا کر سکتے تھے حکومت نے ان کی پُوری پُوری سرپرستی کی مگر اللہ نے اس طبقے کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اسلام کے فدائیوں نے نہایت واضح اور ٹھوس دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ اسلامی نظام کے اپنانے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پُوری انسانیت کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اسلامی دستور وقت کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا کر سکتا ہے۔ دنیا کا کوئی دوسرا دستور ایسا نہیں جو نوعِ بشری کے سارے دکھوں کا مداوا کر کے اسے صحیح معنوں میں فلاح و کامرانی سے ہمکنار کر سکے۔ دینِ حق کے علمبرداروں نے ایک طرف تو اسلامی نظام کے بارے میں اہلِ مغرب اور اپنے ملک کے بے دین طبقوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کیا اور اس نظام کی برکات سے عوام کو اچھی طرح روشناس کرایا اور دوسری طرف اس معاملے میں انہیں اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا کہ اہلِ پاکستان کا اسلامی نظام سے انحراف خدا اور خلق دونوں سے غداری ہے۔ کیونکہ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ ہی اس سرزمین کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے اب اگر وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام اس ملک میں نافذ کرتے ہیں تو درحقیقت وہ خالقِ کائنات اور اس کی مخلوق کو دھوکا دیتے ہیں۔ اہلِ ایمان کی کوششوں کو اللہ تعالیٰ نے بارآور کیا اور مطالبۂ نظامِ اسلامی نے اس حد تک زور پکڑا کہ حکمران طبقوں کو قرار دادِ مقاصد کی صورت میں اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ پاکستان کے دستور کی اساس اسلامی ہوگی۔ اس کے بعد بھی یہاں کے بے دین طبقے اسلام سے انحراف کی راہیں ڈھونڈتے رہے اور دستور سازی کے کام کو مختلف حیلے بہانوں سے

ٹالتے رہے مگر عوام نے ان کی ایک نہ چلنے دی ۔ بالآخر ۱۹۵۶ء کا دستور سامنے آیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا دستور مدون ہوا جو نہ صرف اساس بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی اسلامی تھا اور جو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اگر سو فیصد نہیں تو بڑی حد تک اسلامی دستور کہلانے کا مستحق تھا۔ قوم نے بھی اس دستور کو قبول کرنے میں پوری آمادگی ظاہر کی مگر عین اس وقت جب اس دستور کے نفاذ کے بعد اس کی بنیاد پر ملک میں نئے انتخابات ہونے والے تھے تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے فوج کی مدد سے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح قوم کی گیارہ سالہ جدوجہد کے نتائج کو برباد کر کے رکھ دیا۔ فوج کے کمانڈر انچیف پورے چار برس تک تو مارشل لا کے مطابق حکومت کرتے رہے اور ۱۹۶۲ء میں قوم کے منشا اور مرضی کے علی الرغم اس پر ایک ایسا دستور مسلط کر دیا جو ہر لحاظ سے آمریت کا آئینہ دار تھا اور جس کی تدوین کی غرض و غایت بجز اس کے اور کوئی نہ تھی کہ ملک میں آمریت کو دوام بخشا جائے اور سربراہ مملکت کی ساری کارروائیوں کو دستور کی رُو سے سندِ جواز حاصل ہو سکے۔

قوم کو ایک غیر اسلامی اور غیر جمہوری دستور کے خلاف از سرِ نو جدوجہد کرنا پڑی اور بڑی دقت کے ساتھ فیلڈ مارشل صاحب مروجہ دستور میں مناسب تبدیلیاں کرنے پر رضامند ہوئے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کے زعما کی گول میز کانفرنس بھی طلب کی اور قوم کے ان دو بڑے مطالبات یعنی براہِ راست انتخابات اور وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت کے قیام کو تسلیم کر لیا۔ ان دو چیزوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ۱۹۶۲ء اور ۱۹۵۶ء کے دستور میں برائے نام فرق رہ جاتا تھا اور قوم ایک صحیح سمت پر گامزن ہونے کے قابل ہو سکتی تھی لیکن اس فیصلہ کن اور نازک مرحلے پر پھر ایک کف بدہن موج اٹھی اور قوم کو اٹھا کر مارشل لا کی تاریکیوں میں پھینک آئی۔

یحییٰ صاحب کو اگر پاکستان کا مستقبل عزیز ہوتا تو وہ نئے دستور کے بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے ۱۹۵۶ء کا دستور نافذ کر دیتے جسے فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے مارشل لا کے ذریعے منسوخ کر دیا تھا۔ اُن کے لیے صحیح اور معقول راستہ بھی یہی تھا کہ جس مقام سے جمہوریت کی گاڑی پٹری سے اُتری تھی اُسے اسی مقام سے پٹری پر ڈال دیتے مگر انہوں نے نہایت سنگین حالات میں ایسے کام اپنے ذمے لے لیے

جنہیں سرانجام دینے کی نہ تو ان میں اہلیت تھی اور نہ حوصلہ اور تدبر۔ جس وقت انہوں نے مسندِ اقتدار سنبھالی اس وقت ملک میں انحاد کی فضا کافی حد تک مکدر ہو چکی تھی اور پوری قوم شدید ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کے غلط طرزِ فکر اور آمرانہ طرزِ عمل نے باطل قوتوں کو کھل کھیلنے کے پورے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمریت کا تحفظ حاصل کر کے باطل نے آزادی کے ساتھ نشوونما پائی اور زندگی کے ہر شعبے میں اپنا تسلط اور بالاتری قائم کرنے کی کوشش کی یحییٰ خان کے دور میں ان قوتوں کو اپنی مذموم کارروائیاں جاری رکھنے کی اور بھی آزادی حاصل ہو تی۔ چنانچہ انہوں نے عوام کے جذبات میں اس قدر ہیجان پیدا کیا کہ اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ اِس انتہائی ہیجان انگیز فضا میں جب عوام کی قوتِ فیصلہ بالکل معطل ہو کر رہ گئی تھی، انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا اور نئی دستور ساز اسمبلی کے بقا کا سارا دارومدار اس بات پر رکھا گیا کہ وہ ۱۲۰ دن کے اندر تدوینِ دستور کے کام کو مکمل کرے۔ افراتفری کے عالم میں بھڑکے ہوئے جذبات کے ساتھ جب عوام کو اپنے نمائندے چننے کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جو زبان کے استعمال کے معاملے میں دوسروں کی نسبت زیادہ مطلق العنان تھے۔ جو عوام کے جذبات سے کھیلنے میں زیادہ مشاق تھے اور جھوٹے وعدوں اور جھوٹی امیدوں کے سہارے مقبولیت حاصل کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ جو شخص سوچنے سمجھنے کی معمولی صلاحیت بھی رکھتا تھا اس کے لیے اس بات کو سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ملک بڑی تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر عوامی جذبات کے سیلِ بے پناہ کے سامنے اُن کی کچھ پیش نہ جاتی تھی اور وہ شدید کرب و اضطراب کے ساتھ اس ہونے والے المیہ کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا ملک کے بہی خواہوں کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ پاکستان کا ایک حصہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ یہ سانحہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ باشندگانِ ملک کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کا جو زہر ایک عرصے سے پھیلایا جا رہا تھا یہ بالکل اس کا فطری نتیجہ تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان اسلام کا رشتہ ہی وہ واحد رشتہ تھا جس نے بُعدِ مکانی کے باوجود باشندگانِ ملک کو ایک دوسرے سے قریب کر رکھا تھا۔ حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے جب یہ رشتہ کمزور اور مضمحل ہوا تو علاقائی تعصبات نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ان تعصبات کی وجہ سے مغربی اور مشرقی بازو کے درمیان نفرت اور حقارت کے شعلے بلند ہوئے جس نے قومی یک جہتی کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ مشرقی پاکستان میں بسنے والوں نے مغربی

پاکستان کے رہنے والوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کیا۔ اور مغربی پاکستان کے باشندوں نے مشرقی پاکستان کے خلاف شدید بیزاری کا اظہار کیا۔ ایک دوسرے کے خلاف اس نفرت و بیزاری کے پیدا کرنے میں عوام کا قطعاً کوئی عمل دخل نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو دونوں بازوؤں میں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ نفرت کی آگ کو برسرِ اقتدار طبقوں کی حماقتوں نے بھڑکایا یا ان طالع آزما اور موقع پرست سیاسی رہنماؤں نے جو اپنے اثرات کے دائروں کے مطابق ملک کے حصے بخرے کرکے ان میں اپنا الگ الگ تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ایک حصے کی مسندِ اقتدار پر صدر بھٹو صاحب براجمان ہوتے اور دوسرے حصے کے تختِ اقتدار پر شیخ مجیب الرحمٰن نے قبضہ کر لیا۔

ہمارے اس ملک پر آمریت مسلط کرنے کے ماضی میں جو بار بار ناکام تجربات ہوئے تھے ان کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ علاوہ اور بہت سے دوسرے اسباب کے پاکستان میں اگر آمریت کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک دو الگ جغرافیائی خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے اس لیے آمریت بیک وقت ان دونوں حصوں پر اپنے پنجے یکساں مضبوطی کے ساتھ نہیں گاڑ سکتی اور اگر گاڑ بھی لے تو اس مضبوطی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک سے ایک بڑھ کر آمر نہایت خوفناک عزائم کے ساتھ ملک پر مسلط ہوا۔ مگر تھوڑی مدت کے بعد ہی اس کا سنگھاسن ڈولنے لگا اور عوام اپنے غصب شدہ جمہوری حقوق واپس لینے میں برابر کامیاب ہوتے رہے۔

اب جبکہ پاکستان کے دونوں حصے دو الگ الگ جغرافیائی خطوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں جن کے مابین کوئی رشتہ اشتراک باقی نہیں رہا، تو آمریت کے علمبرداروں کے لیے ہر حصے میں فاشزم کا قیام کسی حد تک آسان ہو گیا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیں کسی مرحلے پر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کیونکہ ملک کے مستقبل کے لیے یہ ایک شدید خطرے کا الارم بھی ہے۔

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ہمارے ملک کے سربراہوں میں آمریت کا رجحان کن وجوہ کی بنا پر پیدا ہوا اور کن حالات نے اس رجحان کو تقویت پہنچائی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا

(باقی صفحہ ۲ پر)

تفہیم القرآن

الکوثر

(۲)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا[1]۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو[2]۔
تمہارا دشمن[3] ہی جڑ کٹا ہے[4]۔ ع ۱

---

[1] کوثر کا لفظ یہاں جس طرح استعمال کیا گیا ہے اس کا پورا مفہوم ہماری زبان تو درکنار، شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کثرت سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے لغوی معنی تو بے انتہا کثرت کے ہیں، مگر جس موقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اُس میں محض کثرت کا نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت اور ایسی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے جو افراط اور فراوانی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو، اور اس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔ دیباچے میں اس سورہ کا جو پس منظر ہم نے بیان کیا ہے اُس پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال کر دیکھیے حالات وہ تھے جب دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں۔ قوم سے کٹ کر بے یار و مددگار رہ گئے۔ تجارت برباد ہو گئی۔ اولادِ نرینہ تھی جس سے آگے ان کا نام چل سکتا تھا، وہ بھی وفات پا گئی۔ بات ایسی لے کر اٹھے ہیں کہ چند گنے چُنے آدمی چھوڑ کر مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اُن کے مقدر میں اِس کے سوا کچھ نہیں کہ جیتے جی ناکامی و نامرادی سے دوچار رہیں اور جب وفات پا جائیں تو دنیا میں کوئی اُن کا نام لیوا بھی نہ ہو۔ اس حالت میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا تو اِس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمہارے مخالف بے وقوف تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم برباد ہو گئے اور نبوت سے پہلے جو نعمتیں تمہیں حاصل تھیں وہ بھی تم سے چھن گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمہیں بے انتہا خیر اور

بے شمار نعمتوں سے نواز دیا ہے۔ اِس میں اخلاق کی وہ بے نظیر خوبیاں بھی شامل ہیں جو حضورؐ کو بخشی گئیں۔ اس میں نبوت اور قرآن اور علم اور حکمت کی وہ عظیم نعمتیں بھی شامل ہیں جو آپ کو عطا کی گئیں۔ اس میں توحید اور ایک ایسے نظامِ زندگی کی نعمت بھی شامل ہے جس کے سیدھے سادے، عام فہم، عقل و فطرت کے مطابق اور جامع و ہمہ گیر اصول تمام عالم میں پھیل جانے اور ہمیشہ پھیلتے ہی چلے جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس میں رفعِ ذکر کی نعمت بھی شامل ہے جس کی بدولت حضورؐ کا نام نامی چودہ سو برس سے دنیا کے گوشے گوشے میں بلند ہو رہا ہے اور قیامت تک بلند ہوتا رہے گا۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ آپ کی دعوت سے بالآخر ایک ایسی عالمگیر اخوت وجود میں آئی جو دنیا میں ہمیشہ کے لیے دینِ حق کی علمبردار بن گئی، جس سے زیادہ نیک اور پاکیزہ اور بلند پایہ انسان دنیا کی کسی امت میں کبھی پیدا نہیں ہوتے، اور جو بگاڑ کی حالت کو پہنچ کر بھی دنیا کی سب قوموں سے بڑھ کر خیر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ حضورؐ نے اپنی آنکھوں سے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں اپنی دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھ لیا اور آپ کے ہاتھوں سے وہ جماعت تیار ہو گئی جو دنیا پر چھا جانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اِس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ اولادِ نرینہ سے محروم ہو جانے کی بنا پر دشمن تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے گا، لیکن اللہ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی صورت میں آپ کو وہ روحانی اولاد عطا فرمائی جو قیامت تک تمام روئے زمین پر آپ کا نام روشن کرنے والی ہے، بلکہ آپ کی صرف ایک ہی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپ کو وہ جسمانی اولاد بھی عطا کی جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کا سارا سرمایۂ افتخار ہی حضورؐ سے اس کا انتساب ہے۔

یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو اِسی دنیا میں لوگوں نے دیکھ لیں کہ وہ کس فراوانی کے ساتھ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ کوثر سے مراد دو مزید ایسی عظیم نعمتیں بھی ہیں جو آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کو دینے والا ہے۔ اُن کو جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اُن کی خبر دی اور بتایا کہ کوثر سے مراد وہ بھی ہیں۔ ایک حوضِ کوثر جو قیامت کے روز میدانِ حشر میں آپ کو ملے گا۔ دوسرے نہرِ کوثر جو جنت میں آپ کو عطا فرمائی جائے گی۔ اِن دونوں کے متعلق اس کثرت سے احادیث حضورؐ سے منقول ہوئی ہیں اور اتنے کثیر راویوں نے اُن کو روایت کیا ہے کہ اُن کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

حوضِ کوثر کے متعلق حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپ کو عطا ہو گا اور اُس سخت وقت میں، جبکہ ہر ایک العطش العطش کر رہا ہو گا، آپ کی اُمت آپ کے پاس اُس پر حاضر ہو گی اور اس سے سیراب ہو گی۔ آپ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے

ہونگے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہونگے۔ آپ کا ارشاد ہے ھو حوض ترد علیہ امتی یوم القیمۃ "وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز وارد ہوگی" (مسلم، کتاب الصلوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ)۔ انا فرطکم علی الحوض "میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہونگا" (بخاری، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن۔ مسلم کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک اور کتاب الزہد۔ مسند احمد، مرویاتِ عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عباس و ابوہریرہؓ)۔ انی فرط لکم و انا شہید علیکم و انی واللہ لانظر الی حوضی الآن "میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دونگا اور خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اِس وقت دیکھ رہا ہوں" (بخاری، کتاب الجنائز، کتاب المغازی، کتاب الرقاق)۔ انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپ نے فرمایا انکم ستلقون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض "میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور اقربا نوازیوں سے پالا پڑے گا، اس پر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آ کر حوض پر ملو" (بخاری، کتاب مناقب الانصار و کتاب المغازی۔ مسلم، کتاب الامارہ۔ ترمذی، کتاب الفتن)۔ انا یوم القیمۃ عند عقر الحوض "میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہونگا" (مسلم، کتاب الفضائل)۔

حضرت ابو برزۃ اسلمی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا ہے، جو اس کو جھٹلائے اللہ اسے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے (ابوداؤد، کتاب السنۃ)۔ عبیداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتی کہ اس نے حضرت ابو برزۃ اسلمی، براءؓ بن عازب اور عائذؓ بن عمرو کی سب روایات کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ابو سبرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے سن کر نقل کی تھی اور اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد درج تھا کہ الا ان موعدکم حوضی "خبردار رہو، میری اور تمہاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے" (مسند احمد، مرویاتِ عبداللہؓ بن عمرو بن عاص)۔

(۲) اُس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے مگر کثیر روایات میں یہ ہے کہ وہ ایلہ (اسرائیل کے موجودہ بندرگاہ ایلات) سے یمن کے صنعاء تک، یا ایلہ سے عدن تک، یا عمان سے عدن تک طویل ہوگا اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا ایلہ سے جحفہ (جدہ اور رابغ کے درمیان ایک مقام) تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، کتاب الرقاق۔ ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق و عبداللہؓ بن عمر۔ مسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد)۔ اِس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمر ہی کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اس حوض کے متعلق حضورؐ نے بتایا ہے کہ اس میں جنت کی نہر کوثر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) سے پانی لاکر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیه میزابان من الجنة۔ اور دوسری روایت میں ہے یغت فیه میزابان یمدانه من الجنة۔ یعنی اس میں جنت سے دو نالیاں لاکر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی (مسلم، کتاب الفضائل)۔ ایک اور روایت میں ہے یفتح نھر من الکوثر الی الحوض۔ جنت کی نہر کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائیگی (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن مسعودؓ)۔

(۴) اس کی کیفیت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دودھ سے (اور بعض روایات میں ہے چاندی سے اور بعض میں برف سے) زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ اس پر اتنے کوزے رکھے ہونگے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اس کا پانی پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں (بخاری، کتاب الرقاق۔ مسلم، کتاب الطہارت و کتاب الفضائل۔ مسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ و عبداللہ بن عمروؓ بن العاص۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد۔ ابوداؤد طیالسی، حدیث ۹۹۵ و ۲۱۳۵)۔

(۵) اس کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہونگا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دور ہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک)۔ ابن ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں الا وانی فرطکم علی الحوض واکاثر بکم الامم فلا تسودوا وجھی، الا وانی مستنقذ اناسا ومستنقذ اناس منی فاقول یارب اُصیحابی، فیقول انک لا تدری ما احدثوا بعدک۔ "خبردار رہو، میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہونگا اور تمہارے ذریعہ سے دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اپنی اُمت کی کثرت پر فخر کرونگا۔ اس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو، کچھ لوگوں کو میں چھڑاؤنگا اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑائے جائیں گے۔ میں کہونگا کہ اے پروردگار، یہ تو میرے صحابی ہیں۔ وہ فرمائے گا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا نرالے کام کیے ہیں"۔ ابن ماجہ

کی روایت ہے کہ یہ الفاظ حضورؐ نے عرفات کے خطبے میں فرمائے تھے)۔

(۶) اسی طرح حضورؐ نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں ردّ و بدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہونگا کہ اے رب یہ تو میرے ہیں، میری امّت کے لوگ ہیں۔ جواب ملے گا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے پھر میں بھی ان کو دفع کرونگا اور حوض پر نہ آنے دونگا۔ اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں (بخاری، کتاب المُساقات، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفضائل۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد۔ مُسندِ احمد، مرویات ابن عباسؓ)۔

اس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہ سے مروی ہیں، اور سلف نے بالعموم اس سے مراد حوضِ کوثر لیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب الرقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے باب فی الحوض وقول اللہ انّا اعطیناک الکوثر۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضورؐ نے کوثر کے متعلق فرمایا ھو حوض ترد علیہ امتی، "وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت وارد ہوگی"۔

جنت میں کوثر نامی جو نہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوتی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضور کو جنت کی سیر کرائی گئی اور اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے ترشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے قُبّے بنے ہوئے تھے اس کی تہ کی مٹی مشکِ اَذفَر کی تھی۔ حضورؐ نے جبریل سے، یا اُس فرشتے سے جس نے آپ کو سیر کرائی تھی، پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے جواب دیا یہ نہر کوثر ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ (مُسند احمد، بخاری، مُسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابوداؤد طیالسی، ابن جریر)۔ حضرت اَنسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مشک ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مُسند احمد، ترمذی، ابن جریر۔ مُسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے نہر کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا اس کی تہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں، وہ موتیوں اور ہیروں پر بہہ رہی ہے (یعنی کنکریوں کی جگہ اس کی تہ میں یہ جواہر پڑے ہوئے ہیں)، اس کی مٹی مشک سے زیادہ

خوشبودار ہے، اس کا پانی دودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، دارمی، ابو داؤد طیالسی، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ)۔ اسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے وہ گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے حضور کی تواضع کی اور دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، اور اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد اور موتیوں کی ہے (ابن جریر، ابن مردویہ۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے)۔ ان مرفوع روایات کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنت کی یہ نہر لیتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اوپر گزری ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبد اللہؓ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عائشہؓ، مجاہد، اور ابو العالیہ کے اقوال مسند احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن مردویہ، ابن جریر، اور ابن ابی شیبہ وغیرہ محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔

۲؎ اس کی مختلف تفسیریں مختلف بزرگوں سے منقول ہیں۔ بعض حضرات نے نماز سے مراد پنجوقتہ فرض نماز لی ہے، بعض اس سے بقر عید کی نماز مراد لیتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ بجائے خود نماز مراد ہے۔ اسی طرح وَانْحَرْ یعنی نحر کرو سے مراد بعض جلیل القدر بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اسے سینے پر باندھنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ افتتاحِ نماز کے وقت، اور رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھ کر رفع یدین کرنا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بقر عید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ حکم دیا گیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کا مطلب صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اے نبی، جب تمہارے رب نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بھلائیاں عطا کی ہیں تو تم اسی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو۔ یہ حکم اس ماحول میں دیا گیا تھا جب مشرکین قریش ہی نہیں تمام عرب کے مشرکین اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور انہی کے آستانوں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ پس حکم کا منشا یہ ہے کہ مشرکین کے برعکس تم اپنے اسی رویے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو کہ تمہاری نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہو اور قربانی بھی اسی کے لیے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ "اے نبی کہہ

کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا ہوں" (الانعام، ۱۶۲-۱۶۳) یہی مطلب ابن عباسؓ، عطاء، مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، محمد بن کعب القرظی، ضحاک، ربیع بن انس، عطاء الخراسانی، اور بہت سے دوسرے اکابر مفسرین رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے (ابن کثیر)۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بقر عید کی نماز اور قربانی کا طریقہ جاری کیا تو اس بنا پر کہ آیت اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ اور آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ میں نماز کو مقدم اور قربانی کو مؤخر رکھا گیا ہے، آپ نے خود بھی یہ عمل اختیار فرمایا اور اسی کا حکم مسلمانوں کو دیا کہ اُس روز پہلے نماز پڑھیں اور پھر قربانی کریں۔ یہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے، نہ اس کی شانِ نزول ہے، بلکہ ان آیات سے حضورؐ کا استنباط ہے، اور آپ کا استنباط بھی وحی کی ایک قسم ہے۔

سے اصل میں لفظ شَانِئَکَ استعمال ہوا ہے۔ شانی شَنْءٌ سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا "اور اے مسلمانو، کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو"۔ پس شَانِئَکَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپ کو عیب لگاتا ہو، آپ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپ کی توہین کرتا ہو، اور آپ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔

سے ھُوَ الْاَبْتَرُ "وہی اَبْتَر ہے" فرمایا گیا ہے، یعنی وہ آپ کو اَبْتَر کہتا ہے، لیکن حقیقت میں اَبْتَر وہ خود ہے۔ ابتر کی کچھ تشریح ہم اس سے پہلے اس سورۃ کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ یہ لفظ بَتَر سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ مگر محاورے میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس ایک رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے بُتَیْرَاء کہا گیا ہے، یعنی اکیلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَأُ فِیْہِ بِحَمْدِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبْتَرُ "ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ابتر ہے" یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے، اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی ابتر کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ابتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی ابتر ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے برادری اور اعوان و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی ابتر ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا مر گئی ہو، اس کے لیے بھی ابتر کا لفظ

بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب ان سب معنوں میں کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابتر تم نہیں ہو بلکہ تمہارے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ محض کوئی "جوابی حملہ" نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت تو لوگ حضور ہی کو ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ احزاب (۵ھ) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضور کو محصور ہو کر شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ھ میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملک عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے، اور آپ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو اُن میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپ ہی سے نہیں بلکہ آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدّیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ ابتر حضورؐ نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

تفہیم القرآن

الکافرون

نام پہلی ہی آیت قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے لفظ الکافرون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حسن بصری اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں مدنی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور قتادہ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورۃ ہے اور اس کا مضمون خود اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے

تاریخی پس منظر مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔

حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عُزّٰی کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا، ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۱۔ اس پر وحی نازل ہوئی قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ .... اور یہ کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (الزمر، آیت ۶۴) "ان سے کہو، اے نادانو، کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی)۔ ابن عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، اگر تم ہمارے معبود بتوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے"۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ (عبد بن حُمَید)۔

سعید بن میناء (ابو البختری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مُغیرہ، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المطلب اور اُمَیّہ بن خَلَف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ سے کہا "اے محمدؐ، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمہارے ساتھ اُس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پالو گے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ .... (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ہشام نے بھی سیرت میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے)۔

۱۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنی قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیج دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

وَہب بن مُنَبِّہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حُمید۔ ابن ابی حاتم)۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضور کے سامنے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اِس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو ٹوک جواب دے کر اُن کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر اُن سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

موضوع اور مضمون: اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سُورۃ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور اُن کی پُوجا پاٹ اور اُن کے معبُودوں سے قطعی براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور اُنہیں بتا دیا جائے کہ دینِ کفر اور دینِ اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اُن کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو خطاب کر کے اُن کی تجاویزِ مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ اُنہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اِسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دینِ کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے اُن کو اس سے قول اور عمل میں براءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رو رعایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے یہ سُورۃ اُس وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مر کھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اِسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اِس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور اُن کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورہ کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جا سکتا ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے بارہا حضور کو فجر کی نماز سے پہلے اور

مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں قُلْ یٰاَیُّہَا الْکَافِرُوْنَ اور قل ھو اللہ احد پڑھتے دیکھا ہے (اِس مضمون کی متعدد روایات کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور ابن مَرْدُوْیَہ نے ابن عمرؓ سے نقل کی ہیں)۔

حضرت خَبَّابؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹو تو قُلْ یٰاَیُّہَا الْکَافِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، اور حضورؐ کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپ سونے کے لیے لیٹتے تو یہ سورۃ پڑھ لیا کرتے تھے (بزار، طبرانی، ابن مَرْدُوْیَہ)۔

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا "میں تمہیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قل یا ایھا الکافرون پڑھ لیا کرو (ابو یَعلیٰ، طبرانی)۔

حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُعاذ بن جَبَل سے فرمایا سوتے وقت قل یا ایھا الکافرون پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ شرک سے برادت ہے (بَیہقی فی الشعب)۔

فَروَہ بن نَوفَل اور عبدالرحمٰن بن نَوفَل، دونوں کا بیان ہے کہ ان کے والد نوفل بن معاوِیَہ الاَشجعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجیے جسے میں سوتے وقت پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا "قل یا ایھا الکٰفرون آخر تک پڑھ کر سو جایا کرو، کیونکہ یہ شرک سے برادت ہے (مُسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ابی شَیبہ، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیہقی فی الشعب)۔ ایسی ہی درخواست حضرت زید بن حارِثہ کے بھائی حضرت جَبلہ بن حارِثہ نے حضورؐ سے کی تھی اور ان کو بھی آپ نے یہی جواب دیا تھا (مُسند احمد، طَبرانی)۔

جبر و قدر کے درمیان انسانی راہِ عمل

از جناب نعیم صدیقی صاحب

[یہ مقالہ در اصل ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے]

انسانی زندگی میں تقدیر و تدبیر یا جبر و اختیار کے دوگونہ عناصر کے بیک وقت مؤثر ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے، لیکن اگر اس کے تمام اجزا کو ترتیب وار سمجھ لیا جائے تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

۱۔ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور تمام مخلوق اس کی رعیت۔ اس سلطنت میں اللہ تعالیٰ کے قوانین، نوامیس، اور سُنن کارفرما ہیں۔ ان قوانین کے کئی دائرے ہیں۔ مثلاً طبعی قوانین جو سائنسی تحقیقات سے واضح ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرے ہیں انسانی نفس، ذہن یا قلب کو انضباط میں رکھنے والے قوانین۔ تیسرے ہیں تاریخ میں اقوام و ملل اور معاشروں کے احوال کے مدوجزر کے قوانین۔

ان سب چیزوں سے خدا کا تکوینی یا مشیئتی نظام عبارت ہے۔ خدا کے تکوینی قوانین اور نظامِ مشیت کے سامنے ہر چیز اور ہر جاندار بے بس ہے (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا)،

(۲) مگر انسانوں کو تکوین و مشیت کے اِس جبری نظام میں محدود سی آزادیٔ فکر و عمل AUTONOMY دی گئی ہے۔ وہ تقدیری قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے مختلف راستوں میں سے کسی کا انتخاب کر سکتا ہے اور ان پر گامزن ہونے کی مساعی کو روبعمل لا سکتا ہے۔

(۳) محدود دائرے میں اُسے جو جُزوی اختیار دیا گیا ہے، اس کے صحیح استعمال کے لیے حسبِ ذیل اہتمام کیے گئے ہیں۔

الف۔ انسان کے اندر طلبِ ہدایت کا واضح رجحان پایا جاتا ہے جس کے تحت وہ بُرائی کے مقابلے میں بھلائی، جھوٹ کے مقابلے میں سچ، نامعقول کے مقابلے میں معقول، ظلم کے مقابلے میں عدل، گندگی کے مقابلے میں صفائی، تاریکی کے مقابلے میں روشنی کو پسند کرتا ہے۔ اسی داعیہ کے تحت ہر مذہب، نظریہ اور

نظام کے علم بردار صداقت، راستی، شرافت، انصاف، ہمدردی، اخوت، اور انسان دوستی وغیرہ اصطلاحات کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم اور ان کے اطلاق میں مغالطے بھی لاحق ہوتے ہیں اور جان بوجھ کر بھی دیے جاتے ہیں۔

(ب) انسان کے اندر سچائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کا جو فطری رُجحان، اور خیر و شر اور حق و باطل اور بھلے بُرے کی تقسیم کا جو نفسیاتی داعیہ کام کرتا ہے، اور اسی رُجحان اور داعیے پر اس کا اخلاقی وجود کھڑا ہوتا ہے، اُس کو روشنی اور بینائی بہم پہنچا کر دھندلے تصورات کو واضح شعور اور محکم ایمان تک پہنچانے کے لیے انبیا کے ذریعے خارج میں سامانِ ہدایت بہم پہنچایا گیا ہے۔ الہامی ہدایت انسان کے جذبہ طلبِ ہدایت کی پیاس بجھانے کے لیے حکمت حیات کا مشروب فراہم کرتی ہے۔ انبیاء الہامی ہدایت کے ذریعہ رُشد و غَی کو چھانٹ کر یا حق و باطل، حلال و حرام کو نتھار کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ (قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ)۔

(ج) فطرت میں مشاہدہ و تجربہ کے ذریعے حصولِ علم کا جو محرک رکھا گیا ہے اسے بھی ہدایت کے ذریعے انفس و آفاق کا مشاہدہ کر کے اور تاریخ کے تجربات سے استفادہ کر کے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے چند اصولی نشانات و آیات بہم پہنچا دی گئی ہیں۔

۴۔ انسان کو محدود آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر طلبِ ہدایت کا جذبہ اور خارج میں الہامی دعوت کا سامان فراہم کر دینے کے بعد اسے اس خاص دائرے میں کھلا موقع دیا گیا ہے کہ اپنا راستہ خود تلاش کر کے اس پر بڑھنے کی خود کوشش کرے۔ (فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ)۔ یعنی اس دائرے میں کسی کو جبراً نہ ہدایت کی طرف مار باندھ کر لایا جاتا ہے، نہ جبر تنبیہ کی زنجیروں میں جکڑ کر مشیت الٰہی اسے ضلالت کی طرف لے جاتی ہے، بلکہ ہر شخص قوانینِ مشیّت کے تحت اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر ہدایت کی طرف بڑھے تو فی الحقیقت ان کے اندر اس کا استحقاق موجود تھا، اور اگر ابوجہل محروم رہا تو وہ اس کا مستحق تھا کہ وہ محروم رہے۔

۵۔ قرآن میں واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص جس طرح کا ارادہ و فیصلہ کر لیتا ہے قدرت کی دی ہوئی طاقتیں اور صلاحیتیں اسی کے حق میں کام کرنے لگتی ہیں اور وہ خود بھی تمام ذرائع و وسائل کو اپنے ارادے اور فیصلے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سو جو جدھر چلنا چاہے، مشیت اس کے لیے ادھر چلنے کے پھاٹک کھولتی چلی جاتی ہے۔ خدا ترس

کو پسند کرنے والوں کے لیے کلیہ یہ ہے کہ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو ہماری طرف بڑھنے کے لیے سعی و جہد کریں گے ہم ان پر اپنی راہیں خود آشکارا کرتے جائیں گے نفس پرستی کو پسند کرنے والے کے متعلق فرمایا: نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ ہم اسے اُدھر ہی لے جائیں گے جدھر کو اپنا رُخ پھیر کر اس نے جانا پسند کر لیا ہے۔ یہ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ اتنا جامع کلمہ ہے کہ اس کا اطلاق ٹھیک اسی طرح خیر و شر کی دونوں راہوں پر چلنے والے انسانوں کے لیے یکساں ہوتا ہے جیسے کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔

اسے آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں:

آپ بہ حیثیت کاشتکار جب دل میں فیصلہ کر کے ایک خاص بیج بو دیتے ہیں تو پھر قدرت کی ساری قوتیں زمین، پانی، سورج، شبنم، ہوا، موسم اس بیج کو اگانے اور نشو و نما دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ آپ نے سوچ سمجھ کر لیکائن یا ٹھوہر کے درخت لگاتے۔ اب یہی کاشت شدہ درخت پروان چڑھیں گے اور یہ ممکن نہیں کہ یکایک بدل کر یہ آم اور سیب کے درخت بن جائیں اور ان پر نہایت خوشبودار میٹھا پھل آنے لگے۔ اسی طرح اگر آپ آم اور سیب کاشت کریں گے تو اگر بقیہ تدابیر بھی باحسن وجوہ عمل میں لائی گئی ہوں تو غیر معمولی حوادث کی زد سے جو بھی درخت بچیں گے وہ جب کبھی پھل دے سکیں گے تو خوشبودار اور میٹھے پھل ہی دیں گے۔

ٹھیک اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے نفس کی کھیتی میں عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے ارادے کا بیج بوتا ہے تو وہ نشو و نما پا کر اپنے برگ و بار لائے گا۔ بخلاف اس کے اگر وہ چوری یا خیانت یا زنا یا اغوا کے کسی فعل کے فیصلے کا بیج بوتا ہے تو اس کی تمام قوائے فکر و عمل اسی فعل کی کامیابی کا منصوبہ سوچنے میں لگ جائیں گی۔ اور راستے مال، اوزاروں، اسلحہ اور حمل و نقل کے ذرائع میں سے جو کچھ حاصل ہو گا ان قوتوں کو بھی وہ اس مقصد کے لیے استعمال میں لائے گا۔

(۶) ضروری نہیں کہ کسی شخص کے ہر ارادے، فیصلے اور سعی میں ضرور کامیابی ہو، یا اگر ہو تو لازماً سو فیصد ہو۔ قدرت کے نظامِ تکوینی کے بہت سے عوامل اس کے گرد ایسے کام کر رہے ہوتے ہیں جن پر آدمی کی اولاً نظر نہیں جا سکتی اور نظر جاتی ہے تو بس نہیں چلتا۔ ایسے بہت سے موانع کو ہم حسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے بیان کیا کرتے ہیں۔

لیکن مجرد ایک ارادہ کرنے، ایک فیصلہ طے کرنے اور ایک سعی کا آغاز کرنے سے انسان کے نفس پر قوانینِ مشیت کے تحت ایک خاص عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری شخصیت ایسے ہر خیال تک سے متاثر ہوتی ہے، اور ارادہ

سعی تو خیال سے آگے کی بہت مؤثر چیز ہے۔

۷۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کی حقیقت گذشتہ اشارات پر غور کرنے سے آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں نفسِ انسانی کبھی حالتِ قائمہ STATIC CONDITION میں نہیں رہتا۔ وہ یا تو بلندی کی طرف بڑھے گا یا پستی کی طرف۔ یا آگے کو اقدام کرے گا یا پیچھے پسر کے گا۔ اچھے یا بُرے تغیر کا عمل اس پر جاری رہے گا۔ اور یہ عام جسمانی زندگی میں بھی زیرِ مشاہدہ آتا ہے۔ آپ ایک بیماری سے اگر تغافل برتتے ہیں، بیماری کو بیماری نہیں مانتے، طبیب کی طرف رجوع نہیں کرتے، بد پرہیزی جاری رکھتے ہیں، تو مشیت کے قوانین کے تحت یہ ممکن نہیں کہ بیماری اپنے ابتدائی مرحلے میں رُکی رہے۔ نہیں، اگر صحت و شفا کی طرف جانے کا اہتمام نہ کیا جائے گا تو بیماری میں اضافہ ہوگا۔ یہ اضافہ چونکہ قدرت کے تقدیری قوانین کے تحت آتا ہے اس لیے اس کی نسبت خدا کی طرف کرنا بالکل برحق ہے۔ مگر اس سے قصور وار آدمی بری الذمہ نہیں ہو جاتا جیسے پھانسی لگنے والے کسی مجرمِ قتل کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ حکومت نے اسے پھانسی دے دی، یا جج نے پھانسی کا حکم سنا دیا۔ یا جیل کے عملے نے پھانسی کا رسہ اس کے گلے میں ڈال دیا، مگر اس سے جُرم و قصور کی ذمہ داری حکومت یا جج یا جیل کے عملے کی طرف منتقل نہیں ہوتی، بلکہ وہ مُجرمِ قاتل ہی کے سر رہتی ہے۔ اسی لیے حقیقت کے اعتبار سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کے ذریعے پھانسی کے تختے تک پہنچایا۔ یہی مفہوم ہے اُن آیات کا جہاں معذّب اقوام کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔

۸۔ مُہر ثبت کر دینے کا مفہوم بھی آپ تھوڑے سے غور سے خود سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں مُہر کرنے کے الفاظ ایک پُراسرار غیبی حقیقت کی تعبیر کے لیے تمثیلاً استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے مُراد یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نفس کا روشنی دینے والا دریچہ خود ان کے طرزِ فکر و عمل کی وجہ سے قوانینِ الٰہی کے تحت بند کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر وہ شخص جو ہدایت سے محروم ہو یا کسی غلط مسلک پر زندگی گزار رہا ہو اس کے دل پر مہر کر دی جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دعوتِ نبی پر کوئی ایسا شخص ایمان نہ لاتا جو شرک یا کفر یا فسق و فجور میں مبتلا ہو۔ یہ حادثہ صرف اُن لوگوں کو پیش آتا ہے جو خود بہ طلبِ ہدایت کا راستہ کسی تعصب، کسی ضد، ہٹ دھرمی یا اندھی نفسانیت کی رکاوٹ سے بند کر دیتے ہیں۔

آپ عام زندگی میں کیا یہ نہیں دیکھتے کہ چھوٹے چھوٹے واضح معاملات پر گفتگوؤں کے دوران میں خاندان

کے کچھ لوگ، یا کاروباری شرکاء، یا عام دوست احباب، کسی تعصب یا ضد، یا کسی اندھی جذباتی رو، یا خواہش پرستی اور بندگیٔ مفاد کے کسی رجحان کی زد میں آجاتے ہیں تو وہ بات کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے، سن کر بھی نہیں سنتے۔ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ وہ جان تو لیتے ہیں مگر مانتے نہیں یہی سیاسی اختلافات میں ہوتا ہے اور یہی صورت دینِ حق کے بارے میں فیصلہ کرنے میں پیش آتی ہے۔

پس امرِ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ خدا نے ان کی فطرت میں طلبِ ہدایت کا جو دریچہ کھولا تھا اس کے آگے انہوں نے خود ہی تعصب یا ضد یا مفاد پرستی کی آہنی چادر مڑھ دی۔ یہی ہے کسی کے قلب و ذہن کا مُہر زدہ ہونا۔ انسان کو محدود دائرے میں جو آزادیٔ فیصلہ عطا کی گئی ہے اس کے معاملے میں خدا کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ دل کے دریچے بند کرنے والے کا دریچہ زبردستی کھول دے۔ جب اس نے خود ہی پسند کیا کہ اس کا طلبِ ہدایت کا دریچہ بند رہنا چاہیے تو قدرت بھی اسے بند ہی رکھے گی۔

ایسے ہی لوگ ہیں جن میں بعض خود بھی اپنی داخلی حالت کا شعور رکھتے ہیں (علیٰ نفسہٖ بصیرۃ) اور ان کے اس قسم کے اقوال قرآن میں ملتے ہیں کہ قُلُوبُنَا غُلْفٌ، جان لو کہ ہمارے دلوں کے دروازے بند ہیں، وَفِیٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ، ہمارے کانوں میں گرانی ہے جو داعیٔ حق کی بات سننے کے قابل نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس استحقاقِ خاص کی بنا پر ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ زبردستی طالب ہدایت بنا دے اور جو شخص مثلاً چوری کرنے کے ارادے سے جا رہا ہے اسے خدا کے فرشتے مار باندھ کر مسجد کی صفِ نماز میں جا کھڑا کریں۔

مُہر فی الحقیقت اس کے دل پر لگتی ہے جو خود اپنے دل کو مہر زدہ اور منہ بند رکھنا چاہتا ہے۔ کسی طالبِ ہدایت اور جویائے حق کے دل پر مہر نہیں لگائی جاتی درآنحالیکہ وہ صحیح زندگی کا راستہ معلوم کرنے کے لیے تگ و تاز کر رہا ہو اور محض غفلت و نادانی کا شکار ہو کر غلطیاں کر رہا ہو۔

۹۔ مُہر لگ جانے کے سلسلے میں ایک حدیث بھی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب انسان پہلی بار کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ و اصلاح کرلے تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے، ورنہ وہ مزید گناہ کرتا ہے اور قلب کے سیاہ داغ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پورا قلب یا نفسِ انسانی سیاہی کے گھیرے میں آجاتا ہے۔ قرآن نے اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ کے الفاظ سے اسی کیفیت

کو بیان کیا ہے۔ دوسرے موقع پر فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ اور فِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ کے الفاظ سے اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

حدیث مذکور میں دراصل اُس قانونِ عادت کا بیان ہے جو کائنات کی دوسری موجودات کی طرح انسانی ذہن و نفس پر بھی کارفرما ہے۔ درخت کی کسی ٹہنی کو آپ زور سے ایک بار جھکائیں تو وہ ہاتھ سے چھوٹتے ہی اگرچہ واپس جائے گی مگر اپنی سابق جگہ سے قدرے پیچھے ہی رہ جائے گی۔ آپ دوبارہ، سہ بارہ یہی عمل کرتے رہیں، بالآخر وہ شاخ اپنے اصل مقام سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائے گی۔ ٹھیک یہی کچھ نفسیاتی اور اخلاقی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ کسی غلط حرکت کے نتیجے میں قلب اپنے اصل صحت مندانہ مقام سے تھوڑا سا ہٹ جائے گا اور برسوں غلط حرکات کرتے رہنے کے نتیجے میں وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ کبھی واپس اپنی جگہ پر لوٹ سکے۔

گناہ در گناہ کے چکر میں پڑ جانے سے بُری عادات انسان کو جکڑ کر اس طرح بے بس کر دیتی ہیں کہ وہ ہدایت کی بات سُن کر، سمجھ کر، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے پسند کر کے اور اس پر چلنے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرنے کے باوجود خود پیدا کردہ قفس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ صورت بھی مُہر لگ جانے کے مشابہ ہے۔

قوتوں کے غلط استعمال کے نتائج سے بچنا قدرت کے عادلانہ قوانین کے تحت ممکن نہیں ہے اگر ایک شخص آنکھوں میں ہر روز مرچیں ڈالتے ڈالتے اندھا ہو جائے، یا کانوں کے پردوں کو خود ہی سلائی لے کر چھید ڈالے، یا افیون اور چرس کے استعمال سے دماغی قوتوں کو مضمحل کر لے تو ایسی لغویات کے نتیجے میں وہ قدرت کی عطا کردہ کسی بھی نعمت سے اگر محروم ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

ٹھیک اسی طرح اپنے دل پر مہر کرنے والا بھی اپنے نفسیاتی قویٰ اور قلبی داعیات کے ساتھ غلط سلوک کرتا ہے اور ان کے اچھے پہلوؤں کو خود ہی تباہ کر کے ان کا نقصان بھگتنے کا سزاوار بنتا ہے۔

آخر کوئی شخص اگر خودکشی ہی پر تُل جائے اور وہ کسی پہاڑ سے چھلانگ لگا دے، تیز رفتار گاڑی کے سامنے آکر سر دے دے، یا پٹرول چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا لے، یا پستول کی گولی سر یا قلب سے پار کر لے، تو اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو گا وہ اگرچہ قوانینِ الٰہی اور اذنِ الٰہی اور مشیتِ الٰہی کے تحت ہی ہو گا، لیکن اس کی ذمہ داری ہر لحاظ سے خودکشی کرنے والے پر عائد ہو گی۔ آپ قدرت سے جس طرح یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ پہاڑ سے کودنے والے کے لیے کششِ زمین کو معطل کر دے، اسی طرح

آپ اس سے یہ امید بھی نہیں لگا سکتے کہ اپنے آپ کو ضلالت اور طغیان اور تعصبات اور ضدم ضدا میں مبتلا کرنے والے اور طلبِ ہدایت کے جذبے کو مار دینے والے آدمی کو خدا کی مشیت زبردستی ہدایت یافتگان میں لاکھڑا کرے۔

دلوں کا مہر زدہ ہونا ایک خاص طرح کے قلبی و ذہنی اور عملی و اخلاقی رویوں کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ اِس دنیا میں جہانِ آفاق کی طرح جہانِ اَنفُس کے ہر واقعہ سے ایک نہ ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے میں بنی اسرائیل کے متعلق یہ آیت واضح رہنمائی دیتی ہے کہ فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۔ یعنی میثاق باندھ کر اُسے توڑ دینے کے نتیجے میں وہ لعنت زدہ ہوئے اور ان کے قلوب کو پتھروں کی طرح غیر ہدایت پذیر بنا دیا گیا۔

۱۰۔ موجودات اور خصوصاً انسانوں کے متعلق خدا کا علمِ پیشبیں اور چیز ہے اور ان کو جبراً کسی راستے پر ڈالنا اور چیز۔ ان دو چیزوں کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ مغالطہ میں مبتلا بھی ہوتے اور جان بوجھ کر مغالطہ انگیزی بھی کرتے ہیں۔

علمِ پیشبیں کی مثال (خدا کے علم سے تشبیہ دیئے بغیر) ایسی ہے جیسے ایک مشین کو بنانے یا پل کو تعمیر کرنے والا انجینئر پہلے سے میعاد مقرر کر دیتا ہے کہ یہ دس سال تک صحیح طور پر کام کرے گی، یا جیسے کوئی ماہر طبیب اپنے زیرِ علاج شخص کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے پہلے سے تیمارداروں کو یہ بتا دے کہ فلاں فلاں مراحل سے گزرنے کے بعد اتنے عرصے میں اس کی موت واقع ہو جائے گی، یا جیسے ایک عالمِ فلکیات ریاضی سے حساب لگا کر یہ بتائے کہ فلاں سیارہ فلاں مقام سے اتنے گھنٹے، اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر آتنی رفتار سے گزرے گا، یا جیسے ہم آپ محدود دائرے میں یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ فلاں گاڑی فلاں اسٹیشن پر اتنے بجے پہنچے گی۔ ان ساری مثالوں میں کسی معاملے سے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی واقعہ کے متعلق پیشگی علم ظاہر کرنے والا شخص ہی اُس واقعہ کو جبراً عمل میں لانے کا ذمہ دار بھی ہے۔

انسانی علم و شعور کی اِن انتہائی ناقص مثالوں کو سامنے رکھ کر اب ذرا اُس بے پایاں علمِ خداوندی کی طرف آئیے جس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کے زمانے الگ الگ نہیں ہیں بلکہ بیک وقت سب اس کی نگاہِ علم میں ہیں۔ پھر وہ اپنی پیدا کردہ مخلوق کے قوئی اور صلاحیتوں، اور ان کے اندر مختلف

قسم کے حالات میں پیدا ہونے والے ردِ عمل اور رجحانات، اور ان کے لیے جاری کردہ قوانین کے عمل کے ہر پہلو سے اتنی باریکی سے آگاہ ہے کہ ادنیٰ ترین غلطی کا کوئی امکان اس کے بارے میں تصور میں نہیں لایا جا سکتا ظاہر بات ہے کہ ایسے علیم و خبیر خدا کا علم مستقبل کے بارے میں اتنا ہی صحیح اور قطعی ہو گا جتنا وہ ماضی اور حال کے متعلق ہے۔ اسی علمِ پیشیں کی وجہ سے وہ اپنے پیدا کردہ انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی وجودوں کے متعلق جانتا ہے کہ آزادیٔ فکر و عمل کے محدود دائرے میں اپنی مرضی اور پسند اور ارادے سے کون کب کیا کرے گا۔ علمِ پیشیں تو ایک آئینہ ہے جس میں انسانی کیفیات اور واقعات و حوادث کے تمام چہرے پہلے سے منعکس ہیں۔ اس کے یہ معنی کسی طرح نہیں لیے جا سکتے کہ خدا تعالیٰ خود اپنی عطا کردہ محدود آزادی کے دائرے میں بھی انسان کو اس کی پسند اور مرضی کے خلاف زبردستی دھکیل کر کسی نظریہ و مسلک کی طرف لے جاتا ہے۔

آخر جب ہم خدا کے پیدا کردہ ناقص العلم انسان کسی شخص کے نفسیاتی مطالعے، یا کسی قوم کے سیاسی یا اقتصادی اور اخلاقی احوال کے مشاہدے کی بنا پر دلبشرطیکہ اس کی صلاحیت ہو بڑی حد تک صحیح پیش بینی کر سکتے ہیں کہ اسے آگے چل کر کیا مراحل پیش آئیں گے، اور ایسی پیش بینی کی بنا پر کوئی معقول آدمی ہمیں پیش آنے والے حالات کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتا، تو خدا کے علمِ پیشیں کی بنا پر ہر انسان کی اپنی ذمہ داری کو اٹھا کر خدا تعالیٰ کے کھاتے میں کیونکر ڈالا جا سکتا ہے۔

خدا کا علمِ پیشیں صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ کون سا فرد اور کون سا گروہِ انسانی اپنی محدود آزادی کو اپنی مرضی، پسند اور ارادے سے کیسے استعمال کرنے والا ہے۔ اس کو یہ مفہوم دینا غلط ہو گا کہ خدا نے پہلے سے یہ طے کر دیا ہے کہ فلاں شخص یا فلاں قوم کو فلاں حرکات میں مبتلا کر کے فلاں انجام تک پہنچایا جائے گا۔

۱۱۔ اصل میں لوگوں کو مغالطہ اُن آیات کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے سب کچھ ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے، یا وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمام امور کو قلمِ قدرت رقم کر دینے کے بعد خشک ہو چکا ہے۔

ایسی آیات و احادیث خدا کے علمِ پیشیں کے بارے میں یہ واضح کرتی ہیں کہ ایک تو خدا کے علم کا ہر شوشہ محفوظ ہے اس کا کوئی جزو کبھی ساقط نہیں ہو سکتا، اور دوسرے یہ کہ اس علم میں (نعوذ باللہ) کوئی

ایسی غلطی اور کمی نہیں ہے کہ قلمِ قدرت کو بار بار ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے ، یا کوئی واقعہ اس علم کے خلاف پیش آجائے ۔

اِس علمِ پیشیں ہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اَجرامِ فلکی کی جسامت ، رفتار اور ان کی ترتیب مقرر کی ہے۔ اسی کی بنا پر طبعی اور کیمیاوی عناصر کی اقسام اور ان کی خصوصیات مقرر کی گئیں ۔ اسی کے مطابق حرارت، حرکت اور کشش جیسے قوانین بنائے گئے ہیں ۔ اسی کی بنا پر اشیاء کی ڈیزائننگ کی گئی ہے ۔ اسی کی بنا پر جاندار مخلوق کی ضروریات کے لیے رزق کے خزائن فراہم کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف لوازم پورے کیے جاتے ہیں ۔ اسی علم پیشیں کی بنا پر مختلف کاموں کے لیے فرشتوں کی مناسب تعداد کو ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں ۔ اسی کے تحت ہر وجود کی اجلِ مسمّٰی یا مہلتِ تعامعین کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری کائنات اور خصوصاً عالمِ انسانی کے لیے خدا کی تکوینی حکومت ایک اٹل منصوبہ بندی (PLANNING) کے مطابق کام کرتی ہے ۔ خدا کے ہاں سہ سالہ یا پنج سالہ یا دہ سالہ منصوبے نہیں بنتے کہ ہر بار تجربے کے تحت نئے سرے سے معاملات کا نقشہ بنایا جاتے ، بلکہ اس نے ازل تا ابد کے درمیان نمودار ہونے والے موجودات کے لیے لامتناہی منصوبہ بندی یکبارگی کر لی ہے ۔

اس منصوبہ بندی کے تحت پیشتر سے یہ طے ہے کہ جنت میں کتنے افراد کے لیے کتنی جگہ درکار ہوگی ۔ اور جہنم میں کتنے افراد کے لیے کتنی گنجائش ہونی چاہیے ۔ اسی کے مطابق میدانِ حشر کا مطلوبہ رقبہ پہلے سے معین ہے ۔

اب ذرا یہ فرمائیے کہ کیا آپ ایسے خدا کے تصور کو قابلِ قبول گردان سکتے ہیں جسے آج تک کے ہونے والے واقعات کا تو علم ہو ، لیکن وہ نہ کل کی مخلوق کا اندازہ کر سکتا ہو اور نہ اس کے احوال و ضروریات کا کوئی علم رکھتا ہو ؟ بلکہ بار بار فیصلے کر کے تجربے کی روشنی میں ان کو بار بار بدلتا رہے اور کائنات کسی طے شدہ منصوبے پر چلنے کے بجائے کبھی کسی طرز پر چل رہی ہو اور کبھی کسی طریق پر ۔ کبھی اَجرامِ فلکی کی رفتاریں بھی کچھ اور ہوں اور پھر کسی دن اچانک کچھ اور ہو جائیں ۔ کبھی سیاروں کے مدار کسی اور شکل کے ہوں اور کبھی کوئی اور شکل اختیار کر لیں ۔ کبھی دریا نشیب کو بہا کریں اور کبھی اچانک بلندی کی طرف بہنے لگیں ۔ کبھی زمین یکایک اپنی کشش کھو بیٹھے اور زہرہ یا مریخ کی کشش اتنی زیادہ

بڑھ جائے کہ انسانوں سمیت زمین کسی دوسرے سیارے پر جا گرے۔ یا زمین پر کبھی سامانِ غذا کی بھرمار ہو اور انسان گنتی کے رہ جائیں اور کبھی انسان تو چیونٹیوں کی طرح رینگتے دکھائی دیں لیکن غذائیات کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کبھی نباتات آکسیجن بنانا چھوڑ دیں یا کبھی حیوانات کاربن ڈائی آکسائڈ فراہم نہ کر سکیں۔

اگر ایک عالم الغیب خدا کائنات کا کارپرداز نہ ہوتا تو نظامِ عالم قطعی طور پر بے ڈھنگا اور بے توازن ہوتا۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ چل ہی نہ سکتا۔

۱۲۔ عام طور پر مغالطہ اٹھانے والے خدا کے علم پیشیں کو ارادہ پیشیں یا فیصلہ پیشیں کے معنی میں لیتے ہیں اور اسی تصور کے تحت بحثیں چھیڑتے ہیں۔ بس یہی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ خدا کا علمِ پیشیں، حکم پیشیں یا فیصلۂ پیشیں سے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔

۱۳۔ آپ اور آپ کے کمیونسٹ دوست اگر یہ جانتے ہوں کہ جدید نفسیات نے انسان کو کس درجہ شدید مجبوری کے مقام پر رکھا ہے، اور پھر اسے اقتصادی اور سماجی اور تاریخی عوامل کے درمیان کتنا بے بس قرار دیا ہے، تو پھر آپ دونوں یہ اندازہ کر سکتے کہ اسلام کے دیئے ہوئے تصورِ تقدیر سے تو کئی گنا زیادہ تصورِ جبریت جدید فلسفوں نے دیا ہے۔ ان فلسفوں کو سامنے رکھیں تو انسان قاتل اور چور اور شرابی اور جھوٹا اور خائن اور دغاباز بن کر بھی کسی طرح اپنے افعال کا اخلاقاً ذمہ دار اور قانون کی نگاہ میں مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ستم یہ ہے کہ انسان کو اتنی شدید اور خوفناک قسم کی جبریت کا شکار قرار دینے کے بعد جمہوری اور اشتراکی دونوں قسم کے نظاموں میں اس کے ناپسندیدہ افعال پر اُسے اخلاقاً معتوب اور قانوناً شدید سزاؤں کا مستوجب ٹھیرایا جاتا ہے۔ اگر آپ جدید دور کے تصورِ جبریت کو جسے اشتراکی فلسفہ اور بھی زیادہ سنگین بنا کر سامنے لاتا ہے، پوری طرح سمجھ لیں تو پھر آپ اپنے کمیونسٹ دوست سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس تصورِ جبریت کے سانچے میں رکھ کر ذرا بتائیے کہ انسان اخلاقی یا سماجی لحاظ سے اپنے افعال کا کیسے ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے؟ جو لوگ انسان کو جدید تصورِ جبریت میں رکھ کر دیکھتے ہیں وہ اگر تقدیر و تدبیر یا جبر و اختیار کے درمیان کے اس مقام پر اعتراض اٹھائیں جس پر اسلام نے انسان کو کھڑا کیا ہے تو یہ نہایت مضحکہ خیز بات ہوگی۔

میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جدید تصورِ جبریت کو یہاں پیش کر سکوں، اس کے لیے آپ کو نفسیات اور جدید فلسفۂ تاریخ اور سماجیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (باقی)

ایمان اور سعادتؔ کا باہمی تعلق

عبد الحمید صدیقی

سعادت و خوش بختی قلب و نگاہ کی ایک ایسی فردوسِ گم گشتہ ہے جس کا ہر انسان فطری طور پر طلبگار ہوتا ہے۔ ایک بلند پایہ فلسفی سے لے کر ایک سادہ لوح دیہاتی تک، عظیم الشان محل میں مقیم بادشاہ سے لیکر جھونپڑے میں رہنے والے ایک فقیر بے نوا تک، ہر شخص گوہرِ سعادت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ گوہر نایاب آخر ہے کہاں؟ انسانیت کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اسے اُن مقامات پر ڈھونڈھتی ہے جہاں اس کا وجود ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اُس شخص کے فاتر العقل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جسے تلاش تو لولوئے لالا کی ہو، مگر وہ سمندر کا رُخ کرنے کے بجائے صحراؤں کی خاک چھانتا پھرے۔ ایسے شخص کی قسمت میں اگر محرومی نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ اسی طرح کے فاتر العقل انسانوں نے گوہرِ سعادت کو کبھی مادی ساز و سامان کی فراوانی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور کبھی حسی لذات کی تکمیل میں اسے ڈھونڈا، مگر "قلیس" کے حصے میں سوائے دشت پیمائی کے اور کوئی چیز نہ آئی۔

کیا مادّی عیش و عشرت کا نام سعادت ہے؟ لوگوں کا خیال ہے کہ مادّی ساز و سامان، مال و دولت کی کثیر مقدار اور مادّی نعمتوں کی فراوانی سے آدمی سعادت مند بن جاتا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ اُن ممالک میں جا کر دیکھیے جہاں عوام کا معیارِ زندگی بہت بلند ہے۔ کھانے پینے اور رہائش کی سہولتیں ایک سے ایک بڑھ کر لوگوں کو میسّر ہیں مگر اس کے باوجود وہ زندگی کی تلخیوں کے گلہ مند ہیں اور اپنے آپ کو شدید گھٹن میں مبتلا پاتے ہیں۔ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ مجلّہ "روز الیوسف" کے مدیرِ اعلیٰ نے کئی سال ہوئے دو مقالے شائع کیے تھے جن کا عنوان تھا "اہلِ جنت بھی سعادت مند نہیں"۔ اہلِ جنت سے اُس کی مراد

---

[1] یہ مضمون بھی شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب الحیاۃ والایمان سے ماخوذ ہے۔ (ع-ح)

سوئیڈن کے باشندے ہیں۔ جو معاشی طور پر اتنے ہی فارغ البال ہیں جتنا کہ کوئی شخص تصور کر سکتا ہے۔ اُن کو نہ افلاس کا ڈر ہے نہ بے روزگاری کا خطرہ، نہ بڑھاپے کا خوف۔ حکومت ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کی ضامن ہے۔ وہ معذور اور بے ہنر افراد کی کفالت کرتی ہے۔ رہائش، بیماری اور مہنگائی کے الاؤنس دیتی ہے۔ ہر عورت کو بچے کی تولید پر اُس کی تربیت اور نگہداشت کا وظیفہ ملتا ہے۔ مزید برآں ہر بچے کو بھی چالیس مصری پونڈ کے حساب سے سالانہ امداد دی جاتی ہے۔ کارخانوں میں نوجوانوں کو ہنر آموزی کے علاوہ خوراک اور پوشاک کی سہولتیں حاصل ہیں۔ لازمی فرائض کی ادائیگی کے وقت حادثہ کی صورت میں معقول معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ طلبا کو تعلیمی وظائف اور نو بیاہتا جوڑوں کو گھریلو ساز و سامان خریدنے کے لیے امدادی قرضے دیئے جاتے ہیں۔ غرض ہر فرد کو اجتماعی تحفظ کی مختلف سکیموں کے تحت قومی آمدنی سے پانچ ساڑھے پانچ سو مصری پونڈ سالانہ ملتے ہیں۔ مقالہ نگار صحافی کہتا ہے کہ ایسے معاشرہ میں بھی — جس میں قدم قدم پہ ہر فرد کی کفالت کا اہتمام ہے — لوگ ایک قلق اور اضطراب کا شکار ہیں۔ ان کی زبانوں پہ شکایت اور دلوں میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے اور ان کی مایوسی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے والے ایک دو نہیں اُس "ارضی جنت" میں ہزاروں لوگ موجود ہیں۔

امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ مگر زر و سیم کی فراوانی اُس کے فرزندوں کو بھی سعادت سے بہرہ ور نہیں کر سکی۔ وہاں فلک بوس عمارات ہیں۔ آواز سے تیز چلنے والے طیارے ہیں۔ سونا اُگلتی زمینیں ہیں۔ لیکن اُس کے مفکرین کی آواز پہ کان دھریں، وہ کہہ رہے ہیں "نیویارک کی زندگی ایک حسین و جمیل پردہ ہے جس نے اپنے اندر بربادی و بدبختی کو چھپا رکھا ہے"۔ "نیویارک کا گراں بار تمدن انسانیت کو کچلتا اور روندتا جا رہا ہے"۔ "نیویارک کے باشندے آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ جذباتیت کا بحران ہے۔ ہر لحظہ کام میں لگے ہوئے اور تھکے ماندے امریکی وقت بچانا چاہتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ اُس وقت کو وہ کیسے صرف کریں گے"۔

اِن دو خوش حال ملکوں کے آسودہ و عیش کوش باشندوں پہ ایک نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کثرتِ مال اور اسبابِ عیش و عشرت کوئی ایسی چیزیں نہیں جنہیں ہم سعادت سے تعبیر کر سکتے ہوں۔ سعادت تو درکنار مال و متاعِ دنیا کی فراوانی حضرتِ انسان کے لیے اُلٹا وبال اور مصیبت بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں نفاق گزیدہ زرداروں کے بارے میں فرماتے ہیں :

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ (۹:۵۵)

اُن کے مال و دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعے اُن کو دنیا کی زندگی میں مبتلائے عذاب کر دے۔

اور یہ عذاب کیا ہے۔ مشقت، تھکاوٹ، غم والم اور بیماری۔ اسی مضمون کی یوں تو متعدد احادیث ہیں مگر یہاں ایک نقل کی جاتی ہے۔ حضرت انسؓ رسولِ پاک سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا "جس شخص کو آخرت کی فکر دامنگیر رہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے۔ اُس کی پراگندگی دُور کر دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں پہ آ رہتی ہے۔ اور جسے ہر وقت دنیا ہی کی فکر لاحق رہے اُسے غربت ستاتی رہتی ہے۔ اُس کے معاملات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا کی دولت اُسے اُتنی ہی ملتی ہے جتنی اُس کے لیے مقدر ہو۔" (ترمذی)

کیا سعادت کا راز اولاد میں مضمر ہے؟ | اس میں کچھ شک نہیں کہ اولاد دنیا کی زینت، ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اولاد والدین کے دکھ درد میں شریک اور اُن کے عروج و اقبال اور نیک نامی کا ذریعہ ہے لیکن یہ اس تصویر کا ایک پہلو ہے۔ اگر اس کے سارے ہی پہلو روشن ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اولاد عین سعادت ہے۔ اس کے برعکس انسانی زندگی کے تجربات بتاتے ہیں کہ اولاد ایک قابلِ قدر نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات ایک ناقابلِ برداشت عذاب بھی ثابت ہوتی ہے۔ کتنے ہی والدین ہیں جو اولاد کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں، جن کی شقاوت و بدبختی کا سبب اولاد بنتی ہے۔ بڑی محبت سے جس اولاد کی پرورش کرتے ہیں وہی اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اولاد کی نافرمانیوں کے عبرتناک واقعات سے، ان کی آوارگی و خودسری کی تکلیف دہ داستانوں سے اور اُن کی مجرمانہ زندگی کے المناک نتائج سے جس طرح والدین کے سینے چھلنی ہوتے ہیں کیا اُس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ والدین کی سعادت کا راز اولاد میں مضمر ہے؟ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ "ناگ کے زہریلے ڈنک سے بھی زیادہ المناک چیز اگر کوئی ہے تو وہ نافرمان بیٹا ہے۔" اور ایک مشرقی شاعر اولاد کے ہاتھوں نازل ہونے والے مصائب گنانے کے بعد کہتا ہے۔

؎ لَقَدْ سَعِدَ الَّذِیْ اَمْسٰی عَقِیْمًا ۔ سعادت مند تو وہ ہے جو بے اولاد ہے۔

کیا حقیقتِ سعادت تجرباتی علم ہے؟ | علم نے زندگی کے بہت سے نامعلوم گوشے بے نقاب کیے ہیں انسان کو

لاتعداد نعمتوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا ہے۔ اُسی کے لیے مشکل کو آسان اور بعید کو قریب کر دیا ہے۔ تحقیقی تجربات نے اِسے کامیابیوں سے روشناس بھی کیا ہے اور مزید اکتشافات کے لیے اِس کی پیاس کو بڑھا بھی دیا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ معرفتِ اشیاء حضرتِ انسان کے لیے عینِ سعادت ہے تو ایسا نہیں۔ تجرباتی علم نے انسان کو اضطراب دل بخشا ہے۔ اِسے خواہش اور طلب عطا کی ہے اور خواہش اور طلب کو سعادت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کتنے ہی علماء ہیں جنہوں نے تحقیق و تجربہ میں ساری عمریں کھپا دیں مگر نہ انہیں مقصود ملا نہ گوہرِ سعادت ہی کا کوئی سراغ لگا۔ دمِ آخریں حسرت و افسوس کرتے ہوئے اِس اعتراف پہ مجبور ہوگئے کہ علم نے اُن کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ نطشے نے یہ کہہ کر اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "علم پردۂ غیب کو سرکا دیتا ہے لیکن جب ایک پردہ سرکتا ہے تو کئی اور پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے تاآنکہ خود انسان کمزور پڑ جاتا ہے"۔ برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل کہتا ہے "انسان طبیعیات کے میدان میں جب عناصر سے نبرد آزما ہوتا ہے تو علم کے زور پر غالب آجاتا ہے لیکن جب خود اپنی ذات سے کشتی لڑتا ہے تو علم اُس کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ انسانیت کو فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے والی چیز علم نہیں ایمان ہے"۔ ایک مشہور امریکی ماہرِ نفسیات کہتا ہے کہ "تنہا علم قطعاً اِس قابل نہیں کہ انسان کے لیے اسبابِ سعادت کا اِثبات کر سکے"۔ ... "ہم تازہ بتازہ معلومات اور علمی ترقیات سے زندگی کی مشکلات کا شافی حل دریافت نہیں کر سکتے۔ نہ سعادت کے گھاٹ سے سیراب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ علمی ترقی تو اضطراب و تردد کی ترقی سے عبارت ہے۔

سعادت عینِ ایمان ہے! سعادت ایک روحانی شے ہے جسے آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا ہے نہ کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے۔ نہ اُسے دینار، روبل، ڈالر یا پونڈ سے خریدنا ہی ممکن ہے۔ اُس کا تعلق انسان کے باطن سے ہے اور پاکیزگیِ نفس، اطمینانِ قلب، انشراحِ صدر اور راحتِ ضمیر اس کی علامات ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا اور اُسے دھمکانے لگا کہ میں تجھے شقاوت اور بدبختی سے دوچار کر دوں گا۔ بیوی نے پُرسکون لہجہ میں جواب دیا "آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ نہ مجھے شقی بنانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور نہ میری سعادت و خوش بختی پہ قادر ہیں"۔ خاوند غیظ و غضب کے عالم میں بولا: "کیسے؟" بیوی نے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا "اگر سعادت روپے پیسے میں ہوتی تو وہ آپ روک سکتے تھے۔ زیورات اور ملبوسات میں ہوتی تو آپ ان سے مجھے محروم کر سکتے تھے۔ لیکن وہ تو ایسی چیز میں پنہاں ہے جو

آپ کے بس میں نہیں۔ اور ایک آپ ہی کیا تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے" خاوند نے حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھا "وہ ہے کیا چیز؟" بیوی نے کہا "میری سعادت میرے ایمان میں مضمر ہے۔ اور میرا ایمان میرے دل میں ہے۔ اور میرے دل پہ میرے رب کے سوا کسی کا قبضہ نہیں"۔ یہ ہے ایمان اور سعادت کا باہمی تعلق۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام میں مادّی سر و سامان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم کی سعادت کے لیے صالح بیوی، اچھا گھر اور عمدہ سواری کافی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا "جو شخص اپنے گھر میں امن سے رہتا ہے صحت و عافیت سے بہرہ ور ہے اور اس کے پاس ایک دن کا سامانِ خوراک موجود ہے گویا اس کے لیے پوری دنیا سمیٹ دی گئی ہے"۔

مندرجۂ بالا تصریحات اور حضورِ پاک کے ارشادات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ گوہرِ سعادت انسان کو ایمان کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ ایمان کا ماحول ہی وہ سازگار ماحول ہے جس میں شجرِ سعادت نشو و نما پاتا ہے اور امن و سکینت، محبت، رضا اور امید کے برگ و بار لاتا ہے۔ رہا مادّی سر و سامان تو اس کی نہایت قلیل مقدار بھی کافی ہے۔ یہ قلیل مقدار انسان کی سعادت میں نہ کمی کرتی ہے نہ رکاوٹ ڈالتی ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

سعادت مند انسان جن نعمتوں سے نوازا جاتا ہے اُن میں سے ایک بڑی نعمت اطمینانِ قلب ہے۔ اب ہم اِس بات کا جائزہ لیں گے کہ آیا سکینتِ نفس اور طمانیتِ قلب کسی اور چیز سے بھی حاصل ہو سکتی ہے یا صرف دامنِ ایمان ہی ایک ایسا دامن ہے جس میں یہ متاعِ بے بہا پائی جاتی ہے۔

اطمینانِ قلب ایمان کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتا

دنیا میں اصحابِ علم اور اربابِ فن موجود ہیں۔ قوت و طاقت رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ حسن و جمال کے پیکر بھی پائے جاتے ہیں۔ بے حساب خزانوں کے مالک قارون بھی ہیں اور بڑا جبروت شہنشاہوں کے اقتدار کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان سے پوچھیے کیا وہ اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔ اور یہ منفی جواب حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ مذکورہ صفات اور انعامات بجائے خود کتنے ہی قابل قدر ہوں، اطمینانِ قلب کا بدل ہرگز نہیں بن سکتے۔

سکونِ قلب کی جنسِ نایاب کا مصدر و منبع صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ایمان باللہ۔ ایسا ایمان جو صادق اور عمیق ہو، جسے شک نے مکدّر نہ کر دیا ہو اور نفاق جس میں فساد نہ پیدا کر چکا ہو۔ سکینت ایک

عطیۂ ربانی ہے جو اہلِ زمین میں سے صرف مومنین کے دلوں پر نازل ہوتا ہے تاکہ جب لوگ مضطرب ہوں تو وہ خاطر جمع رکھیں۔ جب لوگ غضبناک ہوں تو وہ صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور جب لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں تو وہ یقین کی دولت سے سرشار رہیں۔ یہی سکینت تھی جس سے ہجرت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک معمور تھا جب آپؐ نے اپنے ساتھی کی پریشانی اور گھبراہٹ پہ فرمایا "اے ابوبکرؓ تمہارا اُن دو کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا خود اللہ ہے۔" نیز یہ کہ "گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

اسبابِ سکینت (۱) مومن فطرت کی آواز پہ لبیک کہتا ہے۔ وہ ہمیشہ فطرت سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی فطرت دو چیزوں سے عبارت ہے مشتِ خاک اور روحِ پاک۔ وہ ہر معاملہ میں جانبِ خاک ہی نہیں جھکا رہتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اندھے بہرے مادے کے پاس آلامِ حیات کا کوئی علاج نہیں۔ وہ مادی احتیاجات کی تسکین کے ساتھ روح کے تقاضوں کو بھی بطریقِ احسن پورا کرتا ہے کیونکہ سکون کی دولت تو اسے رُوح کے تقاضوں کو پورے کرنے ہی سے مل سکتی ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے جسے رجوع الی اللہ سے ہی دُور کیا جا سکتا ہے۔ اِسے وحشت لاحق ہو جاتی ہے جسے ذاتِ حق سے اُنس ہی زائل کر سکتا ہے۔ قلب میں حزن و ملال گھر کر لیتا ہے جس سے معرفتِ ربانی کا سرور ہی نجات دلا سکتا ہے۔ دل قلق اور اضطراب کا شکار ہو تو اُسے ذکرِ الٰہی سے سکون اور قرار نصیب ہوتا ہے۔ اُس میں حسرت کی آگ بھڑک اٹھے تو قضائے الٰہی کا تصور اُسے بجھا دیتا ہے۔" غرض دل کے یہ تمام روگ اُسی وقت دُور ہوتے ہیں جب انسان اپنی فطرت کے مادی پہلو کی طرف نہیں بلکہ روحانی پہلو کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس مومن ہر وقت اس لیے پرسکون رہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت سے انحراف نہیں کرتا۔

مومن اپنی حقیقت سے واقف ہوتا ہے روح کی گہرائیوں میں کچھ سوال اُبھرتے ہیں جن کا صحیح جواب ہر شخص سے اُس کی فطرت مانگتی ہے۔ اور وہ سوالات یہ ہیں۔ انسان کیا ہے؟ یہ جہان کیا ہے؟ انہیں کس نے بنایا ہے؟ کیوں بنایا ہے؟ اِس وسیع و عریض کائنات کے ساتھ انسان کا کیا تعلق ہے؟ اِس کی تدبیر و انتظام کس کے سپرد ہے؟ زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ اِس زندگی کے بعد ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے کئی اور سوالات ہیں جن کا شافی جواب اگر مل جائے تو کوئی چیز انسان کے لیے

وجہ پریشانی نہیں بن سکتی۔ لیکن اگر ان امور کے بارے میں دل و دماغ تذبذب کا شکار رہیں تو ہر کوئی بڑے سے بڑا سہارا بھی سکون و قرار کا موجب نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک ایک مومن قانت کا تعلق ہے وہ اِس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور زمین پر اُس کا نائب ہے۔ اللہ نے ہی پوری کائنات کو پیدا فرمایا ہے اور وہی اس کی تدبیرِ امر فرماتا ہے۔ ایک وقتِ معین تک اس نے جملہ موجودات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ ارادہ و اختیار کی آزادی دے کر اِس کی آزمائش کی جاسکے۔ اُس نے انسان کے لیے دنیا کو دارالعمل بنایا ہے اور موت کے بعد کا عالم دارالجزاء۔ آخرت میں اِسے اپنے ایک ایک عمل کی خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ یہاں جو کچھ وہ بوئے گا وہی آگے چل کر کاٹے گا۔ نیز یہ کہ اِس جہان کی ناپائدار زندگی حقیقی زندگی نہیں اس لیے یہ جس حال میں بھی گزرے صبر و شکر اور اطاعت و استقامت کے جذبے سے گزار دینی چاہیے۔ اصل زندگی آخرت کی لافانی زندگی ہے جس کے بناؤ اور سنوار پر ہر وقت انسان کی نظریں مرکوز رہنی چاہییں اور آخرت اُسی کی سدھرے گی جو دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہے گا۔ حیاتِ دنیا کی فلاح و کامرانی کا راز بھی بندگی حق میں ہی مضمر ہے۔ غرض دارین کی سعادت اُس شخص کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرے اور دونوں جہانوں کی بدبختی اُس کا مقدر ہے جو احکامِ الٰہی سے انحراف کرے۔

اسلام کی یہی وہ تعلیمات ہیں جن میں مذکورہ بالا تمام سوالات کا جواب موجود ہے۔ اور وحیِ الٰہی کے فراہم کردہ اِس علمِ حقیقت نے مومن کو ہر قسم کی کد و کاوش سے نجات دلا دی ہے۔ حقیقتِ ہستی کے اِس شعور کے بعد بندۂ مومن کو کوئی دکھ، تکلیف، کوئی غم و فکر اور کوئی مایوسی و محرومی بے تاب اور بیقرار نہیں کرتی۔

مومن کی راہ اور منزل واضح ہوتی ہے ایمان سے محروم لوگ اس لیے بھی غیر مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کی منزل متعین نہیں ہوتی اور راہ بھی غیر واضح ہوتی ہے۔ کبھی وہ ایک سمت میں چلنے لگتے ہیں اور کبھی بالکل دوسری سمت میں۔ کبھی انہیں کسی کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اور کبھی کسی کی۔ اسی کشمکش میں اُن کی عمر گزر جاتی ہے۔ اور تردد اور تامل کی کیفیت لمحہ بھر کے لیے بھی انہیں سکھ کا سانس نہیں لینے دیتی۔ اُن کی مثال اُس روایتی بوڑھے اور اُس کے بیٹے کی سی ہے جن کے پاس ایک ہی گدھا تھا۔ پہلے بوڑھا سوار ہو گیا اور بیٹا پیدل چلنے لگا، تو قریب سے گزرنے والی چند عورتوں نے باپ کو ملامت کرنا شروع کر دی کہ

زندگی کی اتنی بہاریں دیکھنے کے بعد دنیا سے اس کا جی نہیں بھرا اور نوعمر بیٹے کو پیدل چلنے پر مجبور کر رہا ہے اِن باتوں کا اثر یہ ہوا کہ باپ نیچے اتر آیا اور بیٹا گدھے پر سوار ہو گیا۔ ابھی چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ کچھ اور آدمی بیٹے کو کوستے ہوئے کہنے لگے "دیکھو اِس جوان کو شرم نہیں آتی۔ خود سوار ہے اور ضعیف باپ پیدل چل رہا ہے۔" آخر باپ بیٹا دونوں سوار ہو گئے تو گدھے کی مظلومیت کا رونا رونے والے آ گئے اور جانور کے حق میں رحم کی اپیل کرنے لگے۔ نتیجۃً دونوں گدھے سے اُتر آئے اور پیدل چلنے لگے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ بعض دانشور قسم کے رہگیر جانور رکھنے کے باوجود سواری نہ کرنے پر انہیں بے وقوفی کا طعنہ دینے لگے۔ تنگ آکر بیٹے نے فیصلہ کیا کہ ابا جان گدھے کی ٹانگیں باندھ کر اسے سروں پر اٹھا لیں، شاید لوگ راضی ہو جائیں۔ مگر بوڑھے باپ نے جواب دیا بیٹا ایسی صورت میں ایک تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے، دوسرے لوگوں کی زبانیں پھر بھی بند نہیں ہوں گی۔ جوان آخر جوان تھا، اُس نے اصرار جاری رکھا اور باپ کو اس کام پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ گدھے کے یہ خیر خواہ لوگوں کو راضی کرنے کی دھن میں اسے اٹھائے ہوئے ایک ندی کا پُل عبور کر رہے تھے کہ نامعلوم گدھے کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور باپ بیٹا دونوں کو لے ڈوبا۔

ٹھیک یہی حالت جادۂ حیات میں صفتِ ایمان سے بے بہرہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کو راضی کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کو بھی راضی نہیں کر پاتے۔ انہیں اپنا مفاد اور اپنا عیش و آرام عزیز ہوتا ہے مگر ان چیزوں کو خاطر خواہ نہ پا کر ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہتے ہیں لیکن مومن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر گامزن رہتا ہے۔ اسے اِس بات کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ کوئی اُس کی روش سے ناراض ہوتا ہے یا ناخوش۔ راستے کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت وہ نہ تو چمکتے ہوئے سکوں کے ڈھیروں کی طرف دیکھتا ہے نہ حسی خواہشات اس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ اور نہ تشدد و مصائب اور قتل و استہلاک کے دلدوز مناظر اُسے پریشان کرتے ہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا لالچ، خوف یا دباؤ اسے جادۂ مستقیم سے ہٹاتا ہے۔ اِس دوران میں اُس کی توجہ صرف صحتِ سمت اور منزلِ مقصود پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ راہِ راست سے ذرہ برابر ہٹنا نہیں چاہتا۔ اور رب العٰلمین کی رضا کو ہر شے پر مقدم رکھتا ہے کہ یہی اس کی آخری منزل ہے۔ اِس منزل کو پا لینے کا یقین اُسے ہر مرحلہ میں سکینت و طمانیت سے سرشار رکھتا ہے۔ چاہے وہ مرحلہ تختۂ دار کو چومنے کا

مرحلہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی ایک مرحلہ پر حضرت خبیبؓ بن عدی نے فرمایا تھا: ؎

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا   عَلٰی اَیِّ جَنْبٍ کَانَ فِی اللّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَأْ   یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ

"مجھے کچھ پروا نہیں اگر میں بحیثیت ایک مسلم کے قتل کیا جاؤں۔ کوئی پروا نہیں کہ اللہ کے معاملے میں مجھے کس پہلو مار گرایا جاتا ہے۔ مجھے معبودِ برحق (پہ ایمان لانے) کی وجہ سے قتل کیا جا رہا ہے۔ وہ ذات اگر چاہے تو بریدہ اعضاء کو بھی بابرکت بنا سکتی ہے۔"

مومن موجودات سے مانوس ہوتا ہے | جملہ موجودات کے بارے میں ایک صاحبِ ایمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی اُس کی طرح اللہ کی مخلوقات ہیں۔ اور اللہ کے احکام کی پابند۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی بذاتِ خود اُسے نہ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع۔ بلکہ نفع اور نقصان کے تمام اختیارات اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ اِن حقائق کے ادراک کے بعد مومن کسی چیز سے متوحش نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ مخلوقات کی وسیع برادری میں اپنے آپ کو ایک معزز اور محترم رکن سمجھتا ہے۔ ایسا رکن کہ جس کو دوسری اشیاء پر ایک حد تک تصرف کے اختیارات حاصل ہیں۔ اسی بناء پر زمین، سورج، چاند، سمندر، بیابان، ندی، نالے، ہوائیں، بادل، درخت، پودے، جمادات، اور حیوانات غرض کسی چیز کی طرف سے کوئی خوف یا ادنیٰ سی بے اطمینانی بھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔

موجودات کے وسیع و عریض کارخانے کو دیکھ کر مومن ایک نہایت خوشگوار اثر یہ قبول کرتا ہے کہ تنگی اور گھٹن سے اُسے نجات مل جاتی ہے۔ کائنات کی وسعتیں اُس کے سینے کو بھی فراخ کر دیتی ہیں۔ وہ ارض و سما کی پہنائیوں اور بے کرانیوں کو دیکھ کر اپنی بے بسی اور لاچارگی کا خول توڑ پھینکتا ہے۔ اور بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور کبھی کسی معاملہ میں بھی تھڑدلی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ دل کی یہ کشادگی جب ایک مومن میں پیدا ہو جاتی ہے تو اُس کے بہت سے مسائل اور لاتعداد پریشانیوں کا خاتمہ خود بخود ہو جاتا ہے۔

مومن کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے | انسان کی بہت سی مصیبتوں اور پریشانیوں کا علاج اُس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کر دیتے ہیں لیکن بعض پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں کوئی بھی اس کے کام نہیں آسکتا۔ ایسے عالم میں تنہائی کا جو احساس اُسے ہوتا ہے ایک مغربی دانشور کے قول کے مطابق

وہ ایسا مرض ہے جو عقلی اضطرابات کے بنیادی عوامل میں سے سب سے اہم ہے۔ اِس مرض کا مداوا ڈھونڈنے کی علمائے نفسیات نے بہت کوشش کی ہے لیکن بے شمار تجربات کے بعد انصاف پسند اطباء اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اِس کا بہترین علاج صرف اور ایمان کے پاس ہے۔ ایمان کی آغوش میں پناہ لے کر ہی انسان کو اللہ کی معیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ نہایت مشکل اور کٹھن حالات میں بھی اپنے آپ کو تنہا نہیں پاتا۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ: ۱۱۵)

اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں۔ تو جدھر بھی تم رُخ کرو اُسی طرف اللہ ہے۔ اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (الحدید۔۴)

وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، جو کام بھی تم کرتے ہو اُسے وہ دیکھ رہا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کے تعاقب سے بنی اسرائیل کو اطمینان دلانے ہوئے جو حرفِ تسلّی ادا فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ:

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ۔ (الشعراء۔۶۲)

میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ یقیناً میری رہنمائی فرمائے گا۔

اور جب دامنِ کوہ پہ کھڑے دشمنانِ اسلام کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے تو آپؐ نے فرمایا "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"۔ یہ معیّتِ الٰہی کا یقین ہی تو تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ کے قالب میں ڈھل گیا تھا۔

پس ثابت ہُوا کہ مومن کہیں بھی ہو اور کیسے ہی حالات میں گھرا ہُوا ہو وہ ہر وقت اِس یقین و ایمان سے سرشار رہتا ہے کہ اُس کا خدا اُس کے ساتھ ہے جو اُس کی مدد پر قادر ہے۔ اور اُسے ہر مشکل اور مصیبت سے بچانے کی پُوری قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ معیّتِ الٰہی کا یہ تصوّر جو ہر مومن کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے اس کے سکون و اطمینان کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

نماز اور دعا بھی اسبابِ سکینت میں سے ہیں | سکینت کے جن اسباب و ذرائع تک مادہ پرستوں کی رسائی نہیں اُن میں سے ایک نماز اور دعا ہے۔ نماز مومن کا وہ کارگر ہتھیار ہے جس سے آلام و حوادث میں مدد حاصل کرنے کی تلقین خود خدا نے کی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ طاِنَّ

اللہ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۳)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشان کن مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ نماز کا اہتمام فرماتے اور اپنے آقائے حقیقی کی جناب میں حلِ مشکل کے لیے عرضِ مدعا کرتے۔ نماز کا یہی وہ سکون بخش پہلو ہے جس کی طرف آپ نے اِس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان نماز میں رکھ دیا گیا ہے۔ دُعا یا صلوٰۃ کمزور ناتواں انسان کا تعلق اُس ذات سے جوڑتی ہے جو علیم وخبیر اور علیٰ کلِ شیٍ قدیر ہے۔ جس کا دروازہ ہر وقت کھٹکھٹایا جا سکتا ہے اور جس کے درِ رحمت سے محروم لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف کے اوباشوں کے ہاتھوں انتہائی ناروا سلوک برداشت کر کے بہت مجروح اور لاچار ہو گئے تو آپ نے بارگاہِ ربُّ العزت میں دستِ دُعا اٹھائے۔ اُس وقت آپ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والے کلمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کے نزدیک دُعا کا مقام کیا ہے اور وہ اپنے اندر کتنا وافر سامانِ سکینت رکھتی ہے۔ اللھم اشکو الیك ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین انت رب المستضعفین وانت ربی...

"اے اللہ میں اپنی قوت اور اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور بے بسی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین تو ناتوانوں اور بے کسوں کا پروردگار ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، آخر تو مجھے کس کے حوالے کرنے والا ہے؟ کیا اُس حریفِ بیگانہ کے جو مجھ سے ترشروئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملے پر قابو رکھتا ہے لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پروا نہیں۔ بس تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ میں اِس بات کے مقابلے میں کہ تیرا غضب مجھ پر پڑے یا تیرا عذاب مجھ پر نازل ہو تیرے ہی نورِ جمال کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعے دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں۔ مجھے تو تیری رضامندی اور خوشنودی کی طلب ہے۔ بجز تیرے کہیں سے کوئی قوت وطاقت نہیں مل سکتی۔

مومن کی زندگی حسرتناک نہیں ہوتی | اضطراب اور بے چینی کی ایک وجہ ماضی کے واقعات کا غم، حال کی خاک میں ملتی امنگیں اور مستقبل کے خطرات کا احساس ہے۔ بعض لوگ ماضی کے حادثات پر سالوں کفِ افسوس ملتے ہیں۔ آہیں بھرتے اور نالہ وفریاد کرتے ہیں۔ نتیجۃً یادِ ماضی کا عذاب اُن کے حال پر بھی اثرانداز ہوتا ہے اور اُن کی ہر لحظہ گزرنے والی زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔ پھر بالکل فطری طور پر ان حسرتوں اور

تلخیوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے ڈانڈے مستقبل سے جا ملتے ہیں۔ اس طرح اُن کی پوری بساطِ حیات پہ مایوسیوں کے گہرے اور تاریک سائے پڑنے لگتے ہیں اور ایک دائمی حسرت و افسوس اُن پر مُسلط ہو جاتا ہے۔

زندگی کی تباہی کا یہ عمل اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کی سوچ کا انداز یہ ہو کہ اگر میں یُوں کرتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اگر میں تندرست ہوتا تو آج اِس انجام سے بچ جاتا۔ ہائے میرا فلاں عزیز نہ مرتا۔ کاش اُس وقت مجھے یہ بات سُوجھ جاتی، وغیرہ۔ یہ کاش اور اگر اور ہائے دنیا ئے حسرت کی وہ پرچھائیں ہیں جو ہر مادہ پرست پر ہر وقت پڑتی رہتی ہیں اور اسے ایک اضطرابِ مسلسل سے دوچار رکھتی ہیں۔

اس کے برعکس مومن اپنی کتابِ ماضی کی ورق گردانی اس طرح کبھی نہیں کرتا کہ اُسے پچھتاوا لگ جائے نہ مستقبل کے موہوم وساوس وخدشات کو اُس کی حوصلہ شکنی کی جرأت ہوتی ہے۔ وہ حال کی رنگینیوں اور سنگینیوں میں سے گزرتے ہوئے اپنی نظر سے اِس حقیقت کو کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتا کہ

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝

(الحدید: ۲۲-۲۳)

کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں نہ لکھ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اُس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اُس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔

اِس تعلیم کے مطابق بندۂ مومن جس شعار کو اپناتا ہے وہ ہے الحمد للہ علیٰ کلِّ حالٍ۔ اور درد کی چوٹ پہ جس کلمہ کا سہارا لیتا ہے وہ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون ہے۔ اور آنے والے خطرات کی عمارت مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کی ضربِ محکم سے پیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ نعمتِ ایمان سے بہرہ ور انسان حسرت و افسوس کا کبھی شکار نہیں ہوتا۔

مطبوعات

سیرت المختار صلی اللہ علیہ وسلم | تالیف: الشیخ مصطفیٰ غلا یینی۔ ترجمہ: جناب ملک غلام علی صاحب شائع کردہ: مکتبہ تعمیرِ انسانیت اندرون موچی دروازہ۔ لاہور۔ صفحات: ۱۷۵، قیمت: ۵ روپے۔

یہ سیرت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسی مستند کتاب ہے جو اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے مختصر ہے مگر مواد اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے جامع ہے۔ اس کتاب کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے ایک ممتاز عالمِ دین نے اسے تصنیف کیا ہے اور ایک دوسرے صاحب بصیرت عالمِ دین نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اسے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ فاضل مترجم نے ترجمے کے لیے ایک ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس میں "ترجمہ پن" کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ کتاب کے آخر میں احادیث سے حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات و ہدایات کا ایک نہایت اچھا انتخاب شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب یُوں تو ہر طبقے کے لیے بصیرت افروز ہے لیکن اگر اسے ثانوی تعلیم کے نصاب میں داخل کر لیا جائے تو یہ بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا جائے اور انگریزی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا تک اسے پہنچایا جائے۔

کتابت و طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

معروف و منکر | مصنف: سیّد جلال الدین انصر عمری۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ لاہور۔ صفحات ۲۰۴ سفید کاغذ۔ طباعت آفسٹ۔ قیمت ۸ روپے۔

جناب انصر عمری معروف اہلِ قلم ہیں جن کی تصنیفات خاصا تحقیقی رنگ لیے ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع پر ہے جسے معروف و منکر کے معنیٰ و مفہوم، فرضیت و اہمیت،

شرائط، وسائل و ذرائع، حدود و آداب اور اوصاف وغیرہ چودہ ابواب میں تقسیم کر کے ہر مبحث کو نہایت واضح اور مدلل طور پر پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے بعض چیزیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر معروف کا حکم دینے اور منکرات سے روکنے کے بارے میں عام طور پر جو تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ صرف اہلِ علم کا کام ہے اور عامۃ المسلمین اس ذمہ داری سے سبکدوش ہیں، زائل ہو جاتا ہے۔ اور ناظر کتاب یہ سمجھنے لگتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر مسلمان پر اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق عائد ہوتا ہے۔ دوسری بات خود معروف و منکر کا صحیح تصور ہے۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بداخلاقی کا مرتکب ہوا تو اسے منع کر دیا یا کسی کو نماز روزے کی تلقین کر دی تو حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے حالانکہ معروف و منکر کا مفہوم اس سے بہت کچھ وسیع ہے۔ معروف کے دائرے میں دینِ حق کی ہر تعلیم آتی ہے۔ اور منکر سے مراد ہر خلافِ اسلام چیز ہے۔ خواہ اس کا تعلق اخلاق سے ہو، خواہ معاشرت و معیشت اور حکومت و سیاست سے یا زندگی کے کسی دوسرے شعبے سے۔ کتاب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ کوئی بات دلیل کے بغیر نہیں کہی گئی، کتاب و سنت اور اہلِ تحقیق ائمہ کرام کی تحریروں سے استشہاد کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے تحت سیر حاصل مواد جمع کر دیا ہے۔ بلاشبہ کتاب کی ترتیب و تالیف میں مؤلف نے خاصی محنت کی ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ ہر دیندار کو بالعموم اور عربی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کو بالخصوص کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ احیائے اسلام کی سعی و جہد میں اپنا کردار بحسن و خوبی ادا کر سکیں۔

زیرِ نظر تالیف جہاں مذکورہ محاسن کی حامل ہے وہاں تبصرہ نگار کی رائے میں بعض مقامات پر اس میں غیر ضروری طوالت بھی آگئی ہے۔ مثلاً معروف و منکر کا جامع مفہوم بتانے کے لیے چھتیس صفحات استعمال کیے گئے ہیں۔ جو بہر حال زیادہ ہیں اور تفصیل کا یہی رنگ کم و بیش ہر مبحث میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عربی اور اردو عبارات میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں فاضل مؤلف اور محترم ناشران امور کا خیال رکھیں گے۔

تاریخ بیتُ المقدِس | مُصنّف: ممتاز لیاقت۔ ناشر سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ صفحات ۲۶۸۔ سفید

کاغذ۔ طباعت عمدہ۔ قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے۔

بیت المقدس کے ساتھ یُوں تو شروع ہی سے مسلمانوں کو تعلقِ خاطر رہا ہے لیکن گذشتہ عرب اسرائیل جنگ کے دوران جب یہ مشہدِ انبیاء اہلِ اسلام کی تحویل سے نکل کر یہود کے قبضے میں گیا تو ہر مسلمان کا دل تڑپ اٹھا۔ کرب و اضطراب کی ایک کیفیت تھی جو پُورے عالمِ اسلام پر طاری ہو گئی۔ متاعِ نایاب چھن جائے تو اُس کی قدر و قیمت کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگتا ہے۔ ایسا ہی قبلۂ اوّل کے بارے میں بھی ہُوا۔ یہودی تسلّط کے بعد ہر حسّاس مسلمان اپنی متاعِ گم گشتہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باخبر ہونا چاہتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ جناب ممتاز لیاقت نے "تاریخ بیت المقدس" لکھ کر اس ضرورت کو پُورا کیا ہے۔

کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "صبحِ قیامت" کے عنوان سے فریاد و فغاں کا مرقع ہے۔ دوسرا باب جو اسّی صفحات پر پھیلا ہُوا ہے، ۲۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کے حالات پہ مشتمل بیت المقدس کی مکمل تاریخ ہے۔ تیسرے باب سے لیکر نویں باب تک کا حصّہ دراصل شہرِ مقدس، مسجدِ اقصیٰ، قبۃ الصخرہ اور دوسری متعدد زیارتوں کا ایک جامع تعارف ہے۔ اس سے آگے کے دو باب اُن دردناک حالات کی تصویر پیش کرتے ہیں جو یہودی قبضے کے بعد تباہی و بربادی اور بے حرمتی و آتشزنی کی صورت میں القدس اور نواحی علاقوں میں پیش آئے۔ آخری باب میں صہیونیت اور اس کے آئندہ عزائم کا تذکرہ ہے یعنی نیل سے لے کر فرات تک کے عرب علاقہ پر صہیونی تسلّط۔ اعاذنا اللہ عنہ۔

توضیحِ مدّعا کے لیے چند نقشے اور متعدد تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ پوری کتاب مؤرخانہ شان رکھتی ہے اور فاضل مصنف کی محنت و ریاضت کا منہ بولتا ثبوت بھی۔

"تاریخ بیت المقدس" کا مطالعہ اُن لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو اپنے مسائل کے حل کے لیے کبھی امریکہ اور کبھی رُوس کی طرف رجُوع کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام مسائل بڑی طاقتوں نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے خود پیدا کیے ہیں۔

توقع ہے کہ اِس کتاب کو پڑھ کر مسلمانوں کے دل میں احساسِ زیاں پیدا ہو گا۔ اُن کی غیرت کو جوش آئے گا اور بعید نہیں کہ ایک روز وہ اس چیلنج کو بھی قبول کر لیں جو صہیونیت کے علمبردار عرصے سے

مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔

ہم مصنف اور ناشر کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو منصّۂ شہود پہ لاکر اُردو ادب کی ایک کمی پوری کی ہے۔

سرورِ کونینؐ، اغیار کی نظر میں | مؤلف: بشیر احمد سیّد۔ ناشر: کتاب مرکز بازار فاروق گنج گوجرانوالہ صفحات ۲۰۰۔ کاغذ سفید۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت -/۶ روپے۔

دنیا میں بہت کم شخصیات ایسی گزری ہیں کہ جنہیں اپنوں اور بیگانوں سب نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہو۔ سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کے بعد یہ اعزاز صرف سرورِ کونین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل ہے کہ ہر دَور میں ہر مذہب وملّت کے پیرو آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ آپؐ کا بے داغ کردار اور آپؐ کا عظیم اخلاق ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی بارگاہِ فضائل و محامد میں جو بھی داخل ہُوا، سرِ فخر وغرور جھکا کر داخل ہُوا اور گلہائے عقیدت نچھاور کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بشیر احمد سیّد صاحب نے زیرِ تبصرہ تالیف میں انہی گلہائے عقیدت کو پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ میں متعدد معروف ہندو، سکھ اور مسیحی اہلِ علم کے رشحاتِ فکر شامل ہیں جنہوں نے آپؐ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ آخر میں غیر مسلم شعرائے کرام کا نعتیہ کلام بھی درج ہے۔

اِس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیائے جدید کے غیر مسلم اکابر، اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں کیا احساسات رکھتے ہیں۔

ہماری رائے میں اگر مضامین اور اقتباسات کے مآخذ بھی بیان کر دیئے جاتے تو کتاب کی استنادی حیثیت بہت بڑھ جاتی۔ نیز آئندہ ایڈیشن میں کتابت کی بعض ناگوار غلطیوں کی بھی اصلاح کر دی جانی چاہیے۔

(بقیہ اشارات)

جا سکتا کہ ہمارے ہاں جو شخص بھی برسرِ اقتدار آیا اس نے جمہوری روایات کو پامال کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا اور آمریت کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کا نہایت واضح اظہار گورنر جنرل غلام محمد کے عہدِ حکمرانی میں ہوا۔ اسکندر مرزا کے دورِ حکومت میں اس رجحان نے اچھی خاصی ترقی کی۔ یہاں تک کہ فوج کے کمانڈروں میں جسے دفاعِ وطن کا فریضہ سونپا گیا تھا، فوج کی مدد سے تختِ اقتدار پر قابض ہونے کی جرأت پیدا ہوئی۔ جب وہ عوامی دباؤ کے تحت جمہوریت کی بحالی کے لیے تیار ہوتے تو عنانِ اقتدار فوج کے ایک دوسرے سربراہ نے سنبھال لی۔ اس شخص کی غلط کارروائیوں سے ملک کا نصف حصہ ہم سے چھن گیا، ہمیں بھارت کے ہاتھوں ذلت و رسوائی اٹھانا پڑی۔ ملک کو اس بربادی سے دوچار کرنے کے بعد آخر تختِ اقتدار سے الگ کر دیا گیا مگر جو صاحب اس کے بعد حکومت کے سربراہ بنے وہ آمریت اور مارشل لا کی ان تباہ کاریوں کے عینی شاہد ہونے کے باوجود اس بات پر مُصر تھے کہ انہیں مارشل لا کے مطابق حکومت کرنے کا ایک مدت تک موقع فراہم کیا جائے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہ عوامی فلاح و بہبود کے چند بڑے کام جنگل کے قانون کی تائید ہی سے سرانجام دے سکتے ہیں چنانچہ چند ماہ نہیں بلکہ چند دنوں ہی میں اس قانون کا تحفظ پا کر انہوں نے غیر مسئول اقتدار کی ساری لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ فوج اور انتظامیہ میں جن لوگوں کو بھی اپنی نظر میں ناپسندیدہ پایا انہیں بغیر کوئی وجہ بتائے اور صفائی کا موقع فراہم کیے نکال باہر کیا۔ اسی دوران میں اصلاحات کا ایک بے ڈھنگم پروگرام شروع ہوا۔ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں محنت کشوں کے حوالے کر دی گئیں مگر اس بات کی طرف قطعاً توجہ نہ کی گئی کہ اس صورت میں سرمایہ کاری کا انتظام کس طرح ہوگا، خام مال کہاں سے مہیا ہوگا اور تیار شدہ مال کی کھپت کا کیا انتظام ہوگا۔ اس "مزدور دوستی" کا نتیجہ سامنے ہے کہ پیداوار میں خوفناک حد تک کمی ہو رہی ہے اور زندہ مزدور اب مزدوری کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

زرعی اصلاحات کا حشر بھی سب کو معلوم ہے کہ مزارعین کے قبضے میں زمین تو کم آئی البتہ زمیندار اور مزارع کے درمیان آویزش بلکہ تصادم کی لاتعداد راہیں نکل آئیں، اور اس طرح ملک کا امن غارت ہوا ہے۔ تعلیمی اصلاحات بھی افراتفری کے جس عالم میں ہوئی ہیں اسے دیکھتے ہوئے ان سے کوئی روشن امیدیں وابستہ نہیں کی جا سکتیں الا یہ کہ خداوند تعالیٰ نئی نسلوں پر خاص رحم فرما کر غیب سے ان اصلاحات میں کوئی خیر کا پہلو پیدا کر دے۔

اصلاحات کے یہ سارے کارنامے جس بے تدبیری اور عجلت کے ساتھ سر انجام دیئے گئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ان ذہنوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ جن میں ان کا نقشہ تیار ہوا تھا ان کے مطالعے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ بڑے بڑے کام بغیر کسی صحیح منصوبہ بندی کے سر انجام دینے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں انہیں ان کے نتائج کی اتنی فکر نہیں جتنی کہ اس بات کی فکر کہ ان کے ذریعے وہ عوام میں زندہ باد کے نعرے لگوا سکیں اور مختلف مجالس میں حاضرین سے تالیاں پٹوا سکیں۔ جو لوگ نفسیات کا معمولی علم بھی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ کام کرنے کا یہ انداز اور پھر انہیں اچھالنے کے یہ ڈھنگ اور عوام سے داد و تحسین حاصل کرنے کے یہ طور طریقے ہر لحاظ سے آمرانہ ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔

ان حالات میں اگر برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں یہ خدشہ عوام میں موجود ہو کہ اگر اسے کوئی موزوں موقع مل جائے تو وہ ملک پر آمرانہ نظام مسلط کرنے میں کبھی تامل نہ کرے گا تو اس خدشے کو بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فی الحقیقت ایک دھڑکا ہے جو پاکستان کے ہر بہی خواہ کو ہر وقت لگا رہتا ہے اور جس کے ٹھوس وجوہ موجود ہیں۔

برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں عوام کا دوسرا خدشہ اس کا اسلام کے بارے میں طرزِ عمل ہے اس ملک میں جو فرد یا گروہ بھی مسندِ اقتدار پر فائز ہوا اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو اسلام کا باغی نہیں کہا ہر ایک نے اسلام کا فدائی ہونے کا دعویٰ کیا مگر بدقسمتی سے ان افراد اور طبقوں میں نہایت ہی قلیل تعداد ایسے حکمرانوں کی تھی جن کی زندگیوں میں اسلام کی کوئی جھلک نظر آتی ہو ان کا رہن سہن، انکی عادات و اطوار انکے مشاغل، ان کی مجالس اور انکی دوسری سرگرمیوں کو دیکھکر کوئی شخص مشکل ہی سے باور کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کو سوائے زبانی دعوے کے اسلام سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔ اگر یہاں کے برسرِ اقتدار طبقے اسلام کے معاملے میں مخلص ہوتے تو عوام ان کی پیروی میں دین کی راہ پر چلتے اسلام کے بارے میں حکمران طبقوں میں قول و فعل کے عظیم تضاد کی وجہ سے یہاں باطل قوتوں کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس وقت کا برسرِ اقتدار طبقہ اگر فی الحقیقت اسلام کو دل کی گہرائیوں سے مانتا ہے اور اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی کا ضامن سمجھتا ہے تو پھر اسے زندگی کے ہر گوشے میں اسے اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ اس کے اس مومنانہ طرزِ فکر اور مخلصانہ طرزِ عمل سے قوم کے اندر نئی دینی روح بیدار ہوگی جو نہ صرف اسے تازہ ولولہ اور عزم نو عطا کریگی بلکہ اس کے رگ و پے سے ان ساری برائیوں کا خاتمہ کر دیگی جنکی وجہ سے آج زندگی باشندگانِ ملک کے لیے عذاب بنکر رہ گئی ہے۔ محض دستور میں اسلام کو بطور سرکاری مذہب تسلیم کر لینے سے وہ عظیم انقلاب برپا نہیں ہو سکتا جس کے برپا کرنے کی ذمہ داری پاکستانی حکمرانوں اور عوام دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

اِسلام کا جامع تصور حاصل کرنے کیلیے

مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیجیے

	اعلیٰ	سستا
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۳ - ۲۵	۲ - ۲۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۲ - ۴۰	۱ - ۷۰
خطبات	۷ - ۵۰	
دینیات	۴ - ۰۰	
اِسلام ایک نظر میں	۶ - ۷۵	۴ - ۲۵
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ	۴ - ۴۰	۲ - ۴۰
حج اور اس کے مسائل	۳ - ۷۵	۲ - ۷۰
مختصر احکامِ حج	۲ - ۰۰	
دین کی باتیں	۴ - ۰۰	
دین کی خدمت	۲ - ۲۵	
دین کی حفاظت	۱ - ۳۰	
ایمان کی اہمیت	۲ - ۰۰	
تبلیغ کی حکمت		۰۰ - ۸۵
اِسلام کی تعلیم	۲ - ۵۰	

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

تفہیم القرآن جلد ششم

کو قارئین تک پہنچانے کے لیے پوری مستعدی سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن جلد بندی میں ذرا وقت لگ رہا ہے۔ تاہم جتنی تعداد میں جلدیں تیار ہو کر آ رہی ہیں وہ خریدار اور ایجنٹ حضرات کو بالاقساط ارسال کی جا رہی ہیں۔ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ ہر آرڈر کی بروقت تعمیل کی جائے۔

ادارہ انفرادی خریدار اور ایجنٹ حضرات سے جلد ششم کی ترسیل میں تاخیر کا معذرت خواہ اور دلی تعاون کا شکرگزار ہے

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور